جلد ۲۴ وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین عدد ۴، ۵

ماہنامہ

میثاق

لاہور

دسمبر ۱۹۷۶ء

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

★

مرتب

جمیل الرحمٰن

یکے از مطبوعات

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۱۲ - افغانی روڈ، سمن آباد - لاہور

فون: ۴۱۳۹۴۵

چندہ سالانہ -/۱۵ ——— قیمت فی نسخہ -/۳

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۲۴ | ماہ نومبر - دسمبر ۱۹۷۶ء | شمارہ ۵،۴

● عرض احوال	جمیل الرحمٰن	صفحہ	۱
● تذکرہ وتبصرہ	ڈاکٹر اسرار احمد	,,	۴
● زوال امت کے اسباب (چند اشعار)	علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم	,,	۵۰
● شاہ ولی اللہ دھلوی (نشری تقریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	,,	۵۱
● شاہ ولی اللہ دھلوی کی قرانی خدمات	شیخ محمد اکرام مرحوم	,,	۵۵
شیخ الھند مولانا محمود حسن دیوبندی کا ایک سبق آموز واقعہ	مولانا مفتی محمد شفیع رح	,,	
● اصلاح امت کا واحد طریق	مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم	,,	
● عظمت قرآن	پروفیسر حافظ احمد یار	,,	۵۵
● افہام و تفہیم	جمیل الرحمن	,,	۷۸
● قرانی تربیت گاہ رپور تاثر	قاضی عبدالقادر (کراچی)	,,	۸۸
● رفتار کار	جمیل الرحمٰن	,,	۹۸

جمیل الرحمٰن نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

عرضِ احوال

اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ خلوص واخلاص کے ساتھ جو کام بھی کیا جائے وسائل و ذرائع کے فقدان یا ان کی محدودیت کے باوجود اسے لازماً برکت حاصل ہوتی ہے۔ پھر اگر یہ کام اللہ کے دین اور اس کی کتاب کی خدمت سے متعلق ہو تو یہ برکت سوا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ کے ایک عاجز بندے ——— ڈاکٹر اسرار احمد ——— نے وسائل و ذرائع کے فقدان اور اپنی بے بضاعتی وبے مائگی کے احساس و اعتراف کے باوصف آج سے تقریباً نو سال قبل، احساسِ فرض اور احساسِ مسئولیت کے پیشِ نظر خالصتاً اللہ تعالیٰ کی نصرت کے توکل پر تن تنہا جس دعوت کا آغاز کیا تھا، اس کو قبولِ عام حاصل ہوا اور ڈاکٹر صاحب کی اس پکار پر کہ :-

> اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی کا خواب، اُمّتِ مسلمہ میں "تجدیدِ ایمان" کی عمومی تحریک کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اس کے لیے لازم ہے کہ اوّلاً منبعِ ایمان ویقین یعنی قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر واشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

~ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر ۔۔۔ راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا!

کے مصداق اعوان وانصار ملتے چلے گئے اور پہلے مرحلے کے طور پر نومبر ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آگیا۔ جس کے حسبِ ذیل مقاصد متعیّن ہوئے :

- عربی زبان کی تعلیم وترویج
- قرآنِ مجید کے مطالعے کی عام ترغیب وتشویق
- علومِ قرآنی کی عمومی نشرواشاعت
- ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو تعلیم وتعلّمِ قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں اور :-
- ایک ایسی "قرآن اکیڈمی" کا قیام جو قرآنِ حکیم کے فلسفہ وحکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے"۔ الحمدللہ ان نشاناتِ راہ کی طرف بتدریج پیش قدمی جاری ہے۔

دوسرے مرحلہ کے طور پر بفضلِ ایزدی مارچ ۱۹۷۵ء میں 'شہادت علی الناس' اور 'اظہارِ دینِ حق' علی الدین کلّہٖ کی اجتماعی سعی و جہد کے لیے "تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ بھی ترتیب پا گیا جس کی دعوت کے اساسی نکات دعوتِ تجدیدِ ایمان - توبہ- تجدیدِ عہد مقرر ہوئے۔ فلہ الحمد والمنۃ

ان دونوں کاموں کی وسعت اور پھیلاؤ کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات میں بھی دوچند اضافہ ہو گیا۔ یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ کی کتاب ہی کا اعجاز ہے کہ ——— ڈاکٹر صاحب کے درسِ قرآنِ حکیم کو اللہ تعالیٰ نے پاکستان گیر مقبولیت سے نوازا اور ملک کے مختلف بڑے بڑے شہروں میں دعوت الی اللہ و دعوت رجوع الی القرآن کے لیے ڈاکٹر صاحب کے مستقل دورے شروع ہو گئے۔ لاہور میں دو مقامات پر از سورۂ فاتحہ درسِ قرآن مجید کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری ہے۔ ایک مقام پر سورۂ کہف قریب الختم ہے تو دوسرے مقام پر اسی ماہ سورۂ نساء کا آغاز ہوا ہے ——— چنانچہ ان مصروفیات کا دوسرے کاموں پر اثر پڑنا قدرتی تھا — اس کا نمایاں اثر تو ماہنامہ 'میثاق' کی اشاعت کی عدم پابندی کی صورت میں قارئینِ میثاق کے سامنے ہے۔ دوسرا اثر یہ پڑا کہ دعوتی لٹریچر کی اشاعت کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی جا سکی۔ جبکہ اس عاجز کے نزدیک یہ کام تحریک و دعوتِ اسلامی کے لیے اساسی کام کا درجہ رکھتا ہے۔ حلقۂ اثر و نفوذ میں شدت سے یہ پیاس پائی جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا منتخب قرآنی نصاب ضبطِ تحریر ہو کر کتابی صورت میں شائع ہو۔ اسی طرح موصوف کے دعوتی خطابات بھی اشاعت پذیر ہوں۔ ان دونوں کاموں کی تکمیل کے لیے شدید تقاضا بھی مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن امرِ واقعہ کے طور پر صورتِ حال یہ ہے کہ منتخب قرآنی نصاب میں سے "سورۂ والعصر" جو منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز ہے 'راہِ نجات' کے نام سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے (جو ڈاکٹر صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد شائع ہوا ہے) اور دعوتی خطبات میں سے (ڈاکٹر صاحب کی نظرِ ثانی کے بغیر) کراچی کی انجمن نے "نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" "بندگیٔ رب" اور "فریضۂ شہادتِ حق" اپنے طور پر شائع کیے تھے۔ یہ بھی اب ختم ہو چکے ہیں۔ نیز مرکزی انجمن کی طرف سے موصوف کا ایک پرانا اور ایک نیا خطاب 'دعوت الی اللہ' اور 'عظمتِ صوم'

کے نام سے شائع کئے گئے ہیں۔ مزید براں 'تنظیم اسلامی' کے تاسیسی اجلاس کی رُوداد کی اشاعت کی نوبت بھی ابھی تک نہیں آئی۔ جبکہ یہ رُوداد اور منتخب نصاب کے اکثر دروس نیز اکثر خطابات جو ٹیپ سے منتقل کئے گئے ہیں بطورِ مسوّدہ موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی دوسری مصروفیات کے باعث ان پر نظرِ ثانی کی مہلت ہی میسّر نہیں آتی، اس وجہ سے ان کی اشاعت تعویق میں چلی آ رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو ان کاموں کے لیے ایک معاون کی ضرورت تھی جس کے لیے موصوف کی نگاہِ انتخاب اس عاجز پر تھی۔ لیکن اس خاکسار کی اپنی بعض نجی مجبوریاں کراچی سے لاہور منتقل ہونے میں مانع تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے کرم سے ان موانع کو دُور فرمایا اور اس احقر کو یہ توفیق و سعادت عطا فرمائی کہ اس نے اوائل نومبر سے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے توکّل پر ڈاکٹر صاحب کے حسنِ انتخاب کے پیشِ نظر ماہنامہ 'میثاق' کی ترتیب و تدوین اور باقاعدہ اشاعت، تنظیم اسلامی کے ناظمِ عمومی اور مرکزی انجمن کے ——— ناظمِ دفتر ایسی اہم اور گرانبار ذمّہ داریاں سنبھال لی ہیں ——— تینوں کام ہر لحاظ سے "عظیم ترین" ہیں اور اس عاجز کو اپنی بے بضاعتی، کم مائگی اور کوتاہ علمی کا پورا علم و اعتراف اور احساس ہے۔ لیکن ایک تو اللہ کی نصرت و تائید پر توکّل، دوسرے رفقاءِ گرامی کے تعاون کے حصول کی توقّع، تیسرے ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی و نگرانی کے اعتماد، چوتھے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کے جذبے اور پانچویں اس کام کو آخرت میں ماجور ہونے کی امید و رجاء نے اس بارِ گراں کو اٹھانے کے لیے سہارا دیا، عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ——— یہ عاجز اپنے تمام کرم فرماؤں، رفیقوں اور 'میثاق' کے قارئین سے مستدعی ہے کہ وہ اس احقر کے لیے خصوصی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ان جملہ اُمور کو بحسن و خوبی انجام دینے میں خاکسار کی استعانت فرمائے چونکہ حقیقی حامی و ناصر بس اسی کی ذاتِ اقدس ہے۔ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ط

اس عاجز کے پیشِ نظر کام کا نقشہ یہ ہے کہ ماہنامہ 'میثاق' کی پابندیٔ اشاعت کا التزام کیا جائے۔ اس کو دعوت کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنایا جائے۔ مضامین میں تنوّع ہو، چند نئے مستقل عنوانات قائم کئے جائیں اور چند قدیم مستقل عنوانات کی جو عرصہ سے مُعطّل ہیں تجدید کی جائے۔ ان ہی مقاصد کے پیشِ نظر یہ پہلا شمارہ اس عاجز نے مرتّب کیا ہے۔ 'میثاق' کو

بقیہ صفحہ ۶ پر

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ہم اپنا یہ تأثر بھی بیان کر چکے ہیں کہ "دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دورِ جدید کے فاتح ہیں[۱] ....." اور ساتھ ہی تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے اُن کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا جا چکا ہے[۲]۔ اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مختلف النوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے "اسلام کا رشتہ اس کی 'اصلِ ثابت' یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا" ——— اور یہ کہ "ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سرِ نو قرآن حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا ——— اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ ——— 'لا یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا' ——— اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی[۳]!"

---

[۱] 'تذکرہ و تبصرہ' میثاق جنوری ۱۹۷۶ء

[۲] اس ضمن میں حضرت شاہ صاحب کی ہمہ جہتی تجدیدی مساعی کے ایک خاکے پر مشتمل راقم کی ایک مختصر نشری تقریر بھی اسی اشاعت میں شامل کی جا رہی ہے، دیکھیے ص ۵۱

[۳] خاص طور پر ترجمہ و تفسیر قرآن کے ضمن میں جو عظیم خدمات حضرت شاہ صاحب ——— نے سرانجام دیں ان کے کسی قدر تفصیلی ذکر کے لیے اس شمارے میں شیخ محمد اکرام مرحوم کی تالیفِ لطیف 'رودِ کوثر' سے ایک اقتباس شائع کیا جا رہا ہے، دیکھیے ص ۵۵

اس سے پہلے ہم یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ صدرِ اوّل میں اسلام کی عظیم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں :- ایک ایمان ——— وہ ظاہری اور قانونی و فقہی ایمان نہیں جس کا تعلق "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" سے ہے بلکہ وہ حقیقی اور قلبی ایمان جو یقین بن کر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے ——— اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جس کا مقصد ہو 'شہادت علی النّاس' ——— 'اعلاءِ کلمۃ اللہ' اور 'اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ' ——— اور چونکہ ایمانِ حقیقی کا منبع و سرچشمہ ہے قرآنِ حکیم اور جہاد و قتال کی علامت ہے تلوار، لہٰذا 'مردِ مومن' کی شخصیت کا جو ہیولیٰ چشمِ تصوّر کے سامنے اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں بالکل بجا طور پر قرآن ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار!

یہ صحیح ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اپنی زندگی میں سر بکف، سیف بدست اور کفن بر دوش میدانِ جہاد و قتال میں نکلنے کا مرحلہ نہیں آیا۔ لیکن ——— یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے نصف صدی کے اندر اندر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جو غلغلہ سرزمینِ ہند میں بلند ہوا وہ تمام تر ان ہی کی تجدیدی دعوت کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے کہ خود حضرت سیّد احمد بریلویؒ بھی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے تربیت یافتہ تھے اور ان کے دستِ راست تو تھے ہی شاہ اسمٰعیلؒ ابن شاہ عبدالغنیؒ ابن شاہ ولی اللہؒ۔ اور اگرچہ انجامِ کار کے اعتبار سے ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تحریک "شعلۂ مستعجل" کا مصداق بن گئی لیکن اس کی خوش درخشید گی، یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریکِ جہاد کے وابستگان کے ایمان و یقین، ذوق و شوق اور جوش و خروش کے تذکرے سے بے اختیار صحابہ کرامؓ یاد آجاتے ہیں اور سخت حیرت ہوتی ہے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!" اور یہ ایک بیّن ثبوت ہے اس کا کہ اگر دعوت کی اساس اور منہجِ عمل وہی اختیار کیا جائے جو اسلام کے صدرِ اوّل میں کیا گیا تھا تو سیرت و کردار کے وہی نمونے آج بھی تیار ہو سکتے ہیں جو دورِ صحابہؓ کا طرۂ امتیاز ہیں، گویا بقول حکیم مراد آبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی!
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلّط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے نتیجے میں گویا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی ہی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہوگیا تھا۔ تاہم اسے ایک باضابطہ کُل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے غدر یا بغاوت کی صورت میں آخری ہچکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دَور ختم ہوگیا۔ اور تاریخِ ہند کے برطانوی دَور کا آغاز ہوگیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا نصف اوّل ہند میں سخت اضطراب و انتشار اور شکست و ریخت کا زمانہ ہے جس میں مسلمان بالخصوص حد درجہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار رہے۔ مایوسی کے اس غلبے میں جب کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

ظاہر ہے کہ تحریکِ شہیدینؒ ایسی پُرعزیمت دعوت کا پنپنا اور کامیاب ہونا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۸۳۱ء میں شہیدینؒ نے "بخاک و خون غلطیدن" کی روشِ اختیار کرلی اور اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرلیا اور اس طرح بالاکوٹ کی فضاؤں میں دعوتِ ولی اللّٰہی کی یہ پہلی صدائے بازگشت دم توڑ گئی ——— اور بعد میں اگرچہ مجاہدین مسلسل ع "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!" پر عمل پیرا رہے اور ان کی مساعی کا سلسلہ بالآخر ریشمی رومالوں کی تحریک، تک ممتد ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اُن کا نتیجہ کوئی برآمد نہ ہوسکا ——— اور ہندوستان میں انگریز کا اقتدار اور قبضہ دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا۔

برطانوی دور میں مسلمانانِ ہند زندگی اور موت کی جس کشمکش سے مسلسل دوچار رہے اس کے متعدد پہلو تھے، خالص دینی و مذہبی بھی، علمی و فکری بھی، سماجی و مجلسی بھی، قومی و سیاسی بھی ——— ان میں سے اس وقت ہماری گفتگو خالص دینی و مذہبی کشمکش تک محدود ہے (قومی و سیاسی کشمکش کے بارے میں ہم نے ۱۹۶۷ء میں ان صفحات میں تفصیل کے ساتھ اظہار رائے کیا تھا۔ یہ مضامین ان شاء اللہ جلد ہی کتابی صورت میں شائع کر دیئے جائیں گے!) ——— مزید برآں یہ چومکھی جنگ مسلمانوں کو بیک وقت دو دشمنوں سے لڑنی پڑی، انگریزوں سے بھی اور ہندوؤں سے بھی! اور جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے اس میں اوّلاً مسلمانوں کو مدافعت ہی پر اکتفا کرتے بنی اور بہت طویل عرصے بعد ہی یہ صورت پیدا ہو سکی کہ قدم جما کر کسی مثبت اساس پر تعمیرِ جدید کی کوشش شروع کر سکیں۔

خالص مذہبی میدان میں مسلمانوں کو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں کی یلغار سے سابقہ پیش آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہیبر (HABER) لارڈ بشپ آف کلکتہ نے براستہ دہلی بمبئی تک پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں نہ کوئی مذہبی جذبہ باقی رہا ہے نہ سیاسی قوت۔ لہٰذا عیسائیوں کو کھل کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور نوبت بایں جا رسید کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھی عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ تب وہی سُنّتِ الٰہی ظاہر ہوئی کہ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں،
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری!

یہ سعادت اسی خطّے کے حصّے میں آئی جس میں علم و حکمتِ ولی اللّٰہی کے چشمے بہہ رہے تھے کہ ضلع مظفّر نگر کے قصبے کیرانہ سے مولانا رحمت اللہ نامی شخصیت ابھری جس نے پادری فینڈر (FANDER) کی کتاب "میزان الحق" کا دندان شکن اور

مُسکت جواب "اظہار الحق" کے نام سے تحریر کیا۔ نتیجۃً پادری صاحب موصوف کو ہندوستان سے دُم دبا کر بھاگتے ہی بنی ——— (اور پھر جب اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ترکی کو بنایا اور وہاں کے علماء کا ناک میں دم کر دیا اور وہاں سے طلبی پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی ترکی پہنچے تو وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہو گیا)۔ مباحثے اور مناظرے میں اس شکستِ فاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کھلے میدان میں خم ٹھونک کر کبھی نہ کی جا سکی۔ اور اس کی واحد ممکن صورت صرف یہ رہ گئی کہ پسماندہ طبقات کی تالیفِ قلب کے ذریعے کچھ لوگوں کے ناموں کے آگے چپکے سے 'مسیح' کا لاحقہ چسپاں کرا دو اور بس!

دوسری طرف عیسائی پادریوں کے دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی اُبال آگیا۔ اور مسلمانوں پر اُن کا تبلیغی حملہ دو صورتوں میں ہوا: ایک خالص رجعتی اور تنگ نظرانہ انداز میں دوسرے قدرے وسیع المشربی کے رنگ اور ترقی پسندانہ انداز میں ——— ان میں سے پہلے کا حشر تو اگرچہ عیسائی مشنریوں کے انجام جیسا ہی ہوا لیکن جس طرح کوئی بخار جاتے جاتے مریض کے لیے کوئی اذیت بخش چیز چھوڑ جاتا ہے جسے عام گھریلو زبان میں 'بخار کا "موتنا"' کہتے ہیں اسی طرح یہ فتنہ بھی جاتے جاتے جسدِ ملت میں ایک سرطان کی جڑیں جما گیا ——— رہا دوسرے انداز کا حملہ تو اس نے میٹھی چھری والا کام کیا اور مسلمانانِ ہند کے اچھے بھلے حصّے کو متاثر کیا یہاں تک کہ بعض انتہائی اہم شخصیتیں بھی اس کی زُلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئیں۔

اوّل الذکر حملہ ——— آریہ سماجیوں کی جانب سے تھا۔ جنھوں نے ۱۸۷۵ء ہی کے لگ بھگ مسلمانوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا اور ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے تو گویا یہ فتنہ عُروج کو پہنچ گیا تھا۔ ان کے جواب کے لیے علماءِ حق بھی میدان میں آئے لیکن بدقسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیت آنجہانی غلام احمد قادیانی کو حاصل ہو گئی جس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی تالیف "سُرمۂ چشمِ آریہ" ہی کے ذریعے وہ ہر دلعزیزی حاصل کی تھی جو اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہونے کے باعث

چھلک پڑی۔ نتیجۃً وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں کو بھی گمراہ کر گیا۔

مؤخر الذکر حملہ ——— برہمو سماج کی صورت میں سامنے آیا۔ جس کی تاسیس ۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے (ولادت ۱۷۷۰ء، وفات ۱۸۳۳ء) نے کی تھی۔ عجیب بات ہے کہ یہ انتہائی ذہین و فطین اور عالم و فاضل شخص بھی پہلے اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے ہی سامنے آیا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانے کے لیے "تحفۃ الموحدین" تصنیف کی اور اس طرح مسلمانوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ بعد میں یہ شخص اپنشدوں کا پرچارک، ہندوستان کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا نقیب اور ہندی نیشنلزم کا علمبردار بن کر سامنے آیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے اس نے اکبرِ اعظم علیہ ما علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے 'دینِ الٰہی' کے چربے کے طور پر 'وحدتِ ادیان' کا فلسفہ ایجاد کیا۔ جس کے ناوک نے اچھے اچھوں کو زخمی کیا اور بڑے بڑوں کے دلوں کو چھید ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی پوری تحریک اسی ایک شخص کے ظلّ اور بروز کی حیثیت رکھتی ہے اور گاندھی جی کی شخصیت پہ سب سے گہری چھاپ اسی کی نظر آتی ہے۔ عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ جی نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں "تحفۃ الموحدین" تالیف کی اس طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے تحریکِ خلافت میں شمولیت اختیار کی اور وحدتِ ادیان کے فلسفے کو اتنا اچھالا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی عظیم اور نابغہ شخصیت بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئی ع "ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں"

مسلمانانِ ہند کی مثبت احیائی مساعی کا آغاز دراصل بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے ہوا۔ یہ مساعی قومی و ملّی سطح پر اور خالص سیاسی میدان میں بھی ہوئیں اور علمی و فکری سطح پر بھی۔ ہم مختلف مواقع پر اس احیائی عمل کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ رائے کر چکے ہیں۔ آج ہمیں اس ہمہ جہتی عمل کے اس پہلو پر روشنی ڈالنی ہے جو ہمارے نزدیک خالص تجدید و احیائے دین اور بھٹیڑ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اعتبار سے اہم ترین ہے ——— اور وہ یہ کہ بحمد اللہ نگاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پر ہوتا جا رہا ہے اور اُمّتِ مسلمہ

جو کلام اللہ سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو رہی ہے۔

اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور "الفوز الکبیر فی اُصُول التفسیر" کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ان کے دو صاحبزادوں، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے علی الترتیب لفظی و بامحاورہ اردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدینؒ کا ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادرؒ کا ۱۸۱۰ء میں) ——— انیسویں صدی کا اکثر حصہ اگرچہ سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں بیت گیا۔ تاہم اس کے اواخر ہی میں 'رُجُوع اِلَی القرآن' کا وہ عمل پھر شروع ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں پوری شدت کو پہنچا۔

رُجُوع الی القرآن کے اس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ آغازِ کار میں اس میں ان گروہوں نے بھی حصہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور ضَلُّوا وَ اَضَلُّوا کا مصداق کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو "ضَلُّوا ضَلٰلًا م بَعِیْدًا" کی اس حد کو پہنچ گئے کہ اُمّت کو مجبوراً ان کا تعلق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی، اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اُٹھایا جاتا جیسے چکڑالوی و پرویزی ——— تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآن حکیم کی جانب ارتکازِ توجہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حصہ لیا ہے لہٰذا ان کا ذکر کیا جا رہا ہے ——— اسے کسی بھی درجے میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے۔

سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہیئے کہ گذشتہ صدی کے ربع آخر اور موجودہ صدی کے ربع اوّل میں ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ذیل میں برّصغیر پاک و ہند میں کس قدر کام ہوا:

(۱) سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیبُ الاخلاق' میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رُک گیا۔

(۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حیرت دہلوی " " " " "

(۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمد جالندھری " " " " "

(۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی تفسیر شائع ہوئی

(۶) ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بلگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا۔ لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہوگئے۔ لہٰذا یہ نامکمل رہ گیا اور شائع نہ ہوسکا۔

(۷) ۱۹۰۶ء مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔

(۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع مختصر حواشی شائع ہوا (حواشی سورۂ نساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولینا شبیر احمد عثمانیؒ کے)۔

(۹) ۱۹۱۷ء میں محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا (اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہوگئے!)

(۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمد علی لاہوری ہی کی اردو تفسیر شائع ہوئی، اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی، تاہم اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اعتناء و التفات کا ایک سلسلہ گذشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہوگیا تھا اور اس صدی کے رُبعِ اوّل کے ختم ہوتے تک خاصی دلچسپی مسلمانانِ ہند کو قرآنِ حکیم اور اس کے عُلوم و معارف کے ساتھ پیدا ہوچکی تھی۔

ہم اس سے قبل ایک موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرچکے ہیں کہ برِّصغیر پاک و ہند میں ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کے عمل کے دوران دو متضاد نقطۂ ہائے نظر اور طرزِ

ہائے فکر پروان چڑھنے گئے۔ ایک وہ جس کا منبع و سرچشمہ علی گڑھ بنا اور دوسرے وہ جس کے مرکز و محور کی حیثیت دیوبند کو حاصل ہوئی۔ ابتداء میں راسخ العقیدہ علماء کی گرفت مسلم معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ علی گڑھی طرزِ فکر کو اپنے لئے راستہ بنانے میں شدید مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے تحت اُس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور علماء کا حلقۂ اثر سکڑتا چلا گیا۔ تاہم اب بھی ہمارے جسدِ ملی کے بحرِ محیط میں یہ دونوں رَوئیں بالکل مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ کی سی شان کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ اور اگرچہ قومی و سیاسی میدان میں علی گڑھی مکتبِ فکر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تاہم مذہبی میدان میں اب بھی غلبہ و اقتدار راسخ العقیدہ علماء ہی کو حاصل ہے!!!

اس تفرقہ و اختلاف کے جو اثرات ہماری قومی و سیاسی جدّ و جہد پر مترتب ہوئے وہ ہماری اس وقت کی گفتگو کے موضوع سے خارج ہیں۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآنِ حکیم کے جانب توجّہ و التفات کا جو رُجحان پیدا ہوا اس میں بھی یہ دونوں رنگ بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور پر دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک متجدّدانہ رنگ کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سرسیّد احمد خاں مرحوم کی تفسیر کو اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہے اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الہند کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیّت کی حامل ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر "فکرِ قرآنی" کے میدان میں خواہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کی چکڑالویّت ہو خواہ محمد علی لاہوری کی لاہوریّت اور خواہ علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیّت ہو خواہ چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیّت، یہ سب فکرِ سرسیّد ہی کی شاخیں ہیں۔ اور دوسری طرف مولانا تھانویؒ کی "بیان القرآن" پر مبنی تین مزید تفسیریں منصّۂ شہود پر آ چکی ہیں، ایک مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر جس میں تقابلِ ادیان اور خصوصاً بائبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں دوسری مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ توجّہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی

محمد شفیعؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔

جہاں تک مقدّم الذّکر مکاتبِ فکر کا تعلّق ہے، ہمیں ان سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ہم انہیں ضلالت و گمراہی ہی کے مختلف رنگ (SHADES) سمجھتے ہیں۔ باین ہمہ اس جائزے میں ان کا ذکر دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایکؔ یہ کہ اُن کی مساعی سے بھی اُمت کے بعض عناصر میں قرآن مجید سے ایک دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اگرچہ اُن کے زیرِ اثر یہ دلچسپی غلط رُخ پر پڑ گئی، تاہم اِس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر قرآن حکیم کے حقیقی اور اصلی عُلُوم و معارف پیش کئے جائیں تو ان مکاتبِ فکر سے منسلک لوگوں کو بآسانی راغب کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرےؔ یہ کہ اِن مکاتبِ فکر نے گویا ایک دعویٰ (THESIS) کی شکل اختیار کر لی جس کے جوابِ دعویٰ (ANTI-THESIS) کے طور پر راسخ العقیدہ علماء کو ترجمہ و تفسیرِ قرآن کی جانب متوجّہ ہونا پڑا اور اس طرح ایک بڑا ذخیرہ اُردو تراجم و تفاسیر کا تیار ہو گیا۔ جس سے قرآن مجید کی جانب عوام کی توجّہات کے انعطاف کا عمل تیز تر ہو گیا ـــ ویسے یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہوگا کہ خود علماء کے حلقوں میں تا حال قرآنِ حکیم پر توجّہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سیّد محمّد یُوسُف بنّوری مُدّظلہٗ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اُصُولِ حدیث اور اُصُولِ فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اُصُولِ تفسیر پر کُل دو مختصر رسالے ملتے ہیں ایک امام ابنِ تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا؟ ـــ اِس کا جواب تو مولانا نے قدرے توقّف کے بعد یہ دیا کہ اصل میں اُصُولِ فقہ کی کتابوں میں اُصُولِ تفسیر بھی زیرِ بحث آجاتے ہیں لہٰذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن جب مَیں نے دریافت کیا کہ اِس کا کیا سبب ہے کہ آپ کے دار العلوم میں تخصّص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصّص فی الفقہ کا بھی، لیکن تخصّص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں ہے؟ تو اس پر مولانا نے پُوری فراخدلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ یہ ہماری کوتاہی ہے! اسی طرح حیرت ہوتی ہے کہ حلقۂ دیوبند کے علماءِ کرام کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا جو مقام و مرتبہ ہونا چاہیئے اور فی الواقع ہے وہ اظہر من الشّمس ہے لیکن اُن کی آخری نصیحتوں میں سے

اہم ترین نصیحت جسے نقل فرمایا مفتی محمدؐ شفیعؒ نے اس پر عمل کہیں نظر نہیں آتا ——
الا ما شاء اللہ ۔ شیخ الہند کی یہ نصیحت بروایت مفتی محمدؐ شفیعؒ صا۲ پہ نیکم

بہر حال علی گڑھ اور دیو بند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملّتِ اسلامیہ ہند کے محیط میں 'فکرِ قرآنی' کے تین سوتے اور پھوٹے جنہیں مجموعی طور پر SYNTHESIS سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔

(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ ہے علامہ اقبال مرحوم جو معروف و متداول معنوں میں تو نہ مترجمِ قرآن تھے نہ مفسرِ قرآن ۔ بلکہ اُن کی تعلیم بھی نہ کسی دار العلوم میں ہوئی تھی، نہ جامعۂ اسلامیہ میں ۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے ۔ بایں ہمہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومیٔ ثانی' کا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے پُورے اعتماد کے ساتھ مناجات بحضور سیدالمرسلینؐ میں یہ تک کہہ دیا کہ :

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کُن ۔۔۔ ایں خیاباں را ز خارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و رُسوا کُن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا

چنانچہ اُن کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سُرور، محبتِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ ملّی سے مملو ہیں ہی ۔ اُن کے 'خطبات' بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر مطالعۂ قرآنِ حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علامہ مرحوم نے جدید ریاضیات و طبعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآنِ حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دورِ حاضر میں دین و مذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے ۔

علامہ مرحوم کی اس فکری کاوش کے ضمن میں اُن کے معروف ہم نشینوں نے تو کوئی مزید کام نہیں کیا ۔ البتہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اس سلسلے میں خاصی وقیع خدمات سر انجام دیں ۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف 'قرآن اور علمِ جدید' نامی تالیف کے

ذریعے بعض جدید اور اہم نظریوں اور فلسفوں جیسے ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، فرائڈ کا نظریۂ جنس، مارکس کا نظریۂ جدلی مادیت وغیرہ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیا اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی کوشش کی۔ اور دوسری طرف۔ "IDEOLOGY OF THE FUTURE" نامی تصنیف کے ذریعے علامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کو ایک مرتب اور منظم نظامِ فکر کی حیثیت سے واضح کیا اور ثابت کیا کہ نوعِ انسانی کا مستقبل اسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۲) برِصغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مفسرِ قرآن کی حیثیت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لیے کہ 'ترجمان القرآن' کی جلد اوّل ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ شائع ہوئی تاہم اُن کی قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کیلئے دعوت جہاد کا ڈنکا برِصغیر کے طول و عرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے بج چکا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے ——— افسوس ہے کہ ۱۹۲۰، ۱۹۲۱ء میں جب بعض علماء کی مخالفت کے باعث مولانا مرحوم 'امام الہند' کے منصب پر فائز ہوتے ہوتے رہ گئے تو ایک شدید ردِعمل اُن کی طبیعت میں پیدا ہوا اور وہ ؎

"یہ صُور پھونک کر تم سو گئے کہاں آخر؟"

کے مصداق اس راہ ہی کو تج کر انڈین نیشنل کانگرس کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے اور اس طرح کم از کم عارضی طور پر برِصغیر میں قرآنی فکر کے اس دھارے کے سوتے خشک ہو گئے! (مزید افسوسناک امر یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت کے زیرِ اثر مولانا مرحوم 'وحدتِ ادیان' کے بھی پرچارک بن گئے۔ اور اس طرح گویا 'برہمو سماج' کی تقویت کا ذریعہ بن گئے!)

تاہم 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوت اتنی لبودی اور بے جان نہ تھی کہ اس طرح ختم ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ایک دوسری فعّال شخصیت کی صورت میں ظہور کر لیا جس نے اوّلاً مولانا آزاد مرحوم کے نعرۂ جہاد کو ایک مبسوط تصنیف کا موضوع بنایا اور

'الجہاد فی الاسلام' ایسی معرکۃ الآرا کتاب بالکل نوعمری میں لکھ ڈالی اور پھر ۱۹۳۲ء سے مولانا آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' کے ہم نام ماہنامے کے ذریعے قرآنِ حکیم کی ترجمانی اور خاص طور پر اس کی انقلابی دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ یہ ہیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جنھوں نے ایک طرف 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' کے نصب العین کے پیشِ نظر ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' قائم کی اور دوسری طرف 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قرآنِ مجید کی تعلیمات اور خصوصاً اُس کی انقلابی دعوت کا تعارُف برِّصغیر کے طول و عرض میں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نسل کے ایک بہت بڑے حلقے میں کرا دیا ——— اور اگرچہ اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ اپنے پیشرو کی طرح جو ایک وقتی سی رکاوٹ سے بد دل ہو کر کانٹا ہی بدل گیا تھا، مولانا مودودی بھی قیامِ پاکستان کے وقت کچھ فوری سی توقعات اور وقتی سے امکانات سے دھوکہ کھا کر پاکستانی سیاست کے گرداب میں کُود پڑے۔ اور پورے تیس برس ہونے کو آئے کہ وہ پُوری جماعت سمیت اسی صحرائے تیہہ میں سرگرداں ہیں (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چالیس سال پورے کر کے بھی اُنہیں یا اُن کی جماعت کو اس صحرانوردی سے نجات ملے گی یا نہیں؟) ——— اور اس پر بھی جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ عمر کے آخری مرحلے میں 'خلافت اور مُلوکیت' نامی تالیف کے ذریعے مولانا مودودی رفض اور تشیّع کی تقویّت کا موجب بن گئے، تاہم اُن کی خدمات بالکل رائیگاں جانے والی نہیں ہیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کے غلبے کی آرزو پیدا کی ہے اور ہزاروں کو اس جدّ و جُہد میں عملاً مبتلا کیا ہے۔ اور اگرچہ ایک غلط فیصلے اور اس پر بیجا اصرار نے اُن کی چالیس سالہ مساعی کو غلط رُخ پر ڈال کر رکھ دیا ہے۔ تاہم قرآن کی انقلابی دعوت کا جو صُور اُنہوں نے پھُونکا ہے وہ یقیناً بہت سے دلوں کو گرماتا رہے گا اور کیا عجب کہ ابوالکلام آزاد مرحوم ثُمّ ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ دعوتِ جہاد پھر کسی گوشے سے نئی آب و تاب اور تازہ جوش و خروش کے ساتھ اُبھرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ!

(۳) وہ عظیم شخصیّت جس سے برِّصغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا سوتا پھُوٹا، مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کا حسین تر

امتزاج اُن ہی کی ذات میں ہوا[1]۔ انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اس دور کے چوٹی کے علماء سے فارسی، عربی اور دینی علوم کی تحصیل مکمل کرلی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور فکرِ جدید کا مطالعہ براہِ راست کیا۔ اور پھر اُن کی نگاہیں قرآن حکیم پر مرتکز ہوگئیں اور انہوں نے باقی پوری زندگی 'حکمتِ قرآنی' کی گہرائیوں میں غوطے لگانے میں بسر کردی۔ اور اگرچہ اُن کا مزاج "کاتا اور لے دوڑی" کے بالکل برعکس "نیکی کر دریا میں ڈال" والا تھا۔ چنانچہ اپنی زندگی میں مفسّر یا مُصنّف و مؤلّف کی حیثیت سے شہرت پانے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی بلکہ جو کچھ لکھا اُسے حوالۂ صندوق کرتے چلے گئے۔ تاہم اُن کی جو چند مختصر چیزیں اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوئیں۔ انہوں نے ان کے 'تدبّرِ قرآن' کا لوہا وقت کے چوٹی کے علماء و فضلاء سے منوالیا۔ اور اُن کی مساعی کا اصل حاصل یہ برآمد ہوا کہ 'تدبّرِ قرآن' کا صحیح نہج واضح ہوگیا اور قرآن حکیم کے معدنِ علم و حکمت سے معرفت کے ہیرے جواہرات نکالنے کا صحیح طریق معیّن ہوگیا۔

مولانا فراہیؒ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان یہ ہوا کہ انہیں ایسے شاگرد بھی میسّر آگئے جنہیں انہوں نے اپنے طرزِ غور و فکر کی تربیت خود دے کر تیار کردیا تاکہ وہ اُن

---

[1] چنانچہ امام فراہیؒ کی وفات پر جو تعزیتی مضمون مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف شمارہ ۱، ۲ جلد ۲۷ بابت جنوری و فروری ۱۹۳۱ء میں مولانا فراہیؒ ہی کے اس شعر کو عنوان بنا کر لکھا تھا کہ ؎

فغاں کہ گشت نیوشندہ سخن خاموش ۔۔۔ دگر چگونہ تسلّی کنم من ایں لب و گوش

اس کے مندرجہ ذیل ابتدائی الفاظ قابلِ توجّہ ہیں:

"اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کُل وہ تھے، جن کی ولادت اور نشو و نما انقلابِ زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں"۔ ——— بقیہ اگلے صفحے پر

کے بعد ان کی روشن کی ہوئی راہ پر آگے بڑھ سکیں۔ اُن کے اِن تلامذہ میں سب سے نمایاں مقام تو حاصل ہے مولانا امین احسن اصلاحی کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ نماز ایسی گرانمایہ تصانیف کے ذریعے خالص قرآنی علمِ کلام کی تدوین کی راہ کھول دی (مولانا کی یہ چاروں تصانیف اب یکجا 'حقیقتِ دین' کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں) بلکہ، خواہ عمر کے آخری حصّے میں سہی، اپنے استاذ کے اُصول پر باقاعدہ تفسیر 'تدبّرِ قرآن' بھی تحریر کر دی (جواب بحمداللہ تکمیل کو پہنچنے ہی والی ہے) اور دوسرے نمبر پہ ہیں مولانا صدرالدّین اصلاحی جو بھارت ہی میں مقیم ہیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ——— ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم و فہم میں عہدِ حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علمِ کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سُنی سنائی باتیں تھیں۔ لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے۔

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنھوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی شروع کی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ ع "جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا" نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا حال یہ تھا کہ اس نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی بمشکل ہی باور کر سکتے تھے مگر وہ تھے جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں۔"

بے لگام اور مادر پدر آزاد متجدّدین اور روایت پرست و قدامت پسند علماء کے بیَن بیَنْ فکرِ قرآنی' کے یہ تین دھارے جو برِ صغیر پاک و ہند کے محیطِ علمی میں بہہ رہے ہیں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں۔

ان میں سے مؤخّر الذکر دو دھارے تو درحقیقت پھوٹے ہی ایک عظیم اور گھمبیر شخصیّت سے ہیں جس نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض ہی سے ندوۃ العلماءؔ لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا تھا۔ ہماری مراد علاّمہ شبلی نعمانی مرحوم سے ہے جنھیں مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم دونوں کے مُربّی کی حیثیّت حاصل ہے ——— ہم نے اب سے لگ بھگ آٹھ سال قبل ایک مفصّل مضمون ان ہی صفحات میں تحریر کیا تھا جس میں علاّمہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے ذاتی میلانات اور علمی و فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا، جس کی تصویب مولانا عبد الماجد دریا بادی نے، جنھیں بلاشبہ اس قافلے کے آخری مسافر کی حیثیّت حاصل ہے، ان الفاظ میں کی تھی :-

"........حیرت ہوگئی، شبلی، فراہی، ابوالکلام تینوں کی یہ نبّاضی بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کر لی ! ؏

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید !......"

اس تحریر کا حسبِ ذیل اقتباس طوالت کے باوصف، ان شاء اللہ، قارئین پر گراں نہ گذرے گا :

"مولانا شبلیؒ اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصّفات انسان تھے اور ان کی شخصیّت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملّی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ اُن کے اصل جانشین سید سُلیمان ندوی مرحوم کی شخصیّت میں مولانا شبلی کی ہمہ گیر شخصیّت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیرِ اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو اُن کی

بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلیؒ کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اُجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہِ راست تو ندوی نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا کا بڑا حصہ ہے ـــــ اور چونکہ برِّ صغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد اُمور بطورِ قدرِ مشترک بھی ہیں مثلاً ایک یہ کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآنِ حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلیؒ کے بالکل برعکس ـــــ جنھوں نے اپنی 'حنفیّت' کی شدّت کے اظہار کے لیے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصلی ذہنی و علمی مناسبت امام ابنِ تیمیہؒ سے تھی ـــــ لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جب کہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہد خشک تھے۔ مولانا آزاد کی وضع داری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہیؒ پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزاد 'ابوالکلام' تھے اور اُن کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا۔ جبکہ مولانا فراہی نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور عربیّت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سا[illegible]ن مدلل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست

کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی اُن کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا ——— چنانچہ مولانا آزاد طوطیٔ ہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امام الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے اُن کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ——— لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اُٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی اُن کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنھوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرزِ فکر، اور مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے۔ جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرۂ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان، میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ اُردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے۔ پھر سورۂ کہف کے بعض مباحث میں اُن کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ بایں ہمہ قرآنِ حکیم کا کوئی مرتب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآنِ حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبرِ قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اُصول و قواعد از سرِ نو مرتب و مدوّن کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تا حال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتاً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھ دی ———"

قصہ مختصر ——— علامہ شبلی نعمانیؒ، امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام

آزاد کے مابین قرب و یگانگت کا یہی رشتہ تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" کے نصب العین کے پیشِ نظر 'جماعتِ اسلامی' کی تاسیس کی تو ان کی دعوت پر نہ صرف یہ کہ مولانا فراہیؒ کے تمام نمایاں شاگرد بشمول مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، اور مولانا صدرالدین اصلاحی لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے بلکہ مولانا شبلیؒ کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دو ارشد تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ بھی ——— "من نیز حاضر می شوم ....." کے مصداق بن گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس 'قِران السعدین' سے بہت سی برکتیں ظہور میں آئیں جن کا نمایاں ترین مظہر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تالیف 'دعوتِ دین اور اس کا طریق کار' ہے جس میں ایک جانب مولانا فراہیؒ کے قرآنی غور و فکر کا تعمق موجود ہے تو دوسری جانب مولانا آزاد مرحوم کا داعیانہ جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اور اسی کے ذیل میں آتی ہیں مولانا صدرالدین اصلاحی کی بعض تصانیف جیسے 'فریضۂ اقامتِ دین' ——— 'حقیقتِ نفاق' ——— اور 'اساسِ دین کی تعمیر' وغیرہ۔

رہا 'فکرِ قرآنی' کا اوّل الذکر دھارا جس میں علامہ اقبال مرحوم کو تن تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا بقیہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلق اس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدرآباد دکن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و شاداب خطّے میں اقامت گزیں ہونے کی دعوت علامہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علامہ مرحوم کے سب سے بڑے بلکہ غالباً صحیح تر الفاظ میں واحد شیدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں۔

مزید برآں، پنجاب میں مولانا مودودی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی دعوت اور جماعت دونوں کو جو فروغ نصیب ہوا، بعض دوسرے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ اس کا اہم ترین سبب یہی ہے کہ یہاں علامہ اقبال مرحوم اپنے اشعار کے ذریعے گویا قلوب کی دنیا میں ہل چلا چکے تھے اور اب زمین منتظر تھی کہ کوئی آئے اور بیج ڈالے اور یہ اپنے خزانے اُگل کر رکھ

خصوصاً پنجاب کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو گویا اس "دگر دانائے راز" کیلئے چشم براہ تھا جس کا ذکر بہ شدید حسرت و یاس علامہ مرحوم نے مرتے دم کیا تھا!

اِن سُطُور کے ناکارہ و ناچیز راقم کو اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نوجوانی ہی کے دَور میں ایسے مواقع پیدا فرما دیئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بساط کے مطابق فکرِ قرآنی کے متذکرہ بالا تینوں درمیانی دھاروں سے متعارف و مستفید ہوا بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کی وساطت سے اس کا ذہنی رشتہ کم از کم تفسیرِ قرآن کی حد تک ان علماءِ ربّانیین کے حلقے سے بھی قائم ہو گیا جو بلاشبہ "اَلرّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کہلانے کے مستحق ہیں ——— نتیجۃً، بفضل اللہ وعونہٖ اُس کی ذات میں بقدرِ وسعتِ ظرف ان 'انہارِ ثلثہ' کے ساتھ ساتھ یہ چوتھا 'چشمۂ صافی' بھی رواں دواں ہے ——— فلہٗ الحمد والمنّۃ۔

جذباتی سطح پر راقم کی شخصیت پر سب سے پہلی اور سب سے گہری چھاپ علامہ اقبال مرحوم کے اُردو کلام کی ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا پورا زمانۂ طالب علمی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) حقر نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے اشعار پڑھنے اور گنگنانے میں بسر کیا۔ جس سے ایک جذبۂ ملّی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور چونکہ اس وقت اس جذبے کے مظہرِ اتم کی حیثیت تحریکِ پاکستان کو حاصل تھی لہٰذا اس دَور میں اپنی بساط کے مطابق عملی وابستگی تحریکِ مسلم لیگ کی تنظیم طلبہ یعنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ رہی ——— تاہم اسی دَور کے اواخر میں راقم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور 'الہلال' اور 'البلاغ' والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی ——— مولانا مودودی کی تحریروں میں سے یوں تو جو کچھ بھی اس وقت پڑھنے میں آیا بھلا ہی لگا لیکن الحمدللہ کہ ان کے ساتھ راقم کا اصل ذہنی و قلبی رشتہ 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قائم ہوا جس کے سن میں تقسیمِ ہند کے قریب کے زمانے میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' میں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی۔ اس ذہنی و قلبی تعلّق کی گہرائی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ملک

کے ہنگاموں اور آگ اور خون کی وادیوں سے گذر کر جیسے ہی پاکستان پہنچنا نصیب ہوا راقم ان کی تحریک سے وابستہ ہوگیا اور ایک جانب تو اس نے چند ماہ کے اندر اندر ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس طور سے پڑھ ڈالا کہ مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالویؒ کے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ ان کی تصانیف کا "فارغ التحصیل" ہوگیا بلکہ ان کا 'مدرّس' بھی بن گیا۔ اور دوسری طرف زمانۂ طالب علمی کے بقیہ سات سال (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء) ان کی تحریکِ اسلامی کے نذر کر دیئے اور اپنی بیشتر قوتیں اور توانائیاں اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ساتھ عملی وابستگی میں کھپا دیں ——— اس دور کے تقریباً وسط میں (۵۰-۱۹۵۱ء کے لگ بھگ) راقم کا ذہنی رابطہ مولانا امین احسن اصلاحی سے قائم ہوا۔ مولانا کی تحریروں کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے حلقوں میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ ثقیل بھی ہوتی ہیں اور خشک بھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو قلبی انس راقم کو اس وقت تک قرآن مجید کے ساتھ حاصل ہو چکا تھا اس کی بنا پر اسے ان تحریروں میں نہ ثقل کا احساس ہوا نہ خشکی کا۔ مولانا کی تحریریں بھی یوں تو راقم نے سب ہی پڑھ ڈالیں لیکن ان کی دو تصانیف سے تو اسے عشق کی حد تک لگاؤ ہوگیا: ایک 'دعوتِ دین اور اُس کا طریق کار' اور دوسری 'تدبّرِ قرآن' (جواب 'مبادیٔ تدبّرِ قرآن' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے)۔ مولانا کی اِن تصانیف کے مطالعے سے بلاشائبہ ریب و شک راقم کے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی تعلق میں ایک نئے بُعد و عرض (DIMENSION) کا اضافہ ہوا اور پھر جب ۱۹۵۴ء کے لگ بھگ مولانا کا ترجمہ کردہ 'مجموعۂ تفاسیرِ فراہی' شائع ہوا تب تو راقم کو تفسیرِ قرآن کے اس مکتبِ فکر کے اصل منبع و سرچشمہ تک رسائی حاصل ہوگئی فللّٰہ الحمد ——— اسی زمانۂ طالب علمی کے دوران احقر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سے متعارف ہوا (یاد ہوگا، اس کا ایک نہایت اعلیٰ اور حسین و جمیل ایڈیشن کراچی کے بعض اہلِ خیر نے ہانگ کانگ سے طبع کرا کے مفت تقسیم کیا تھا جو بعد میں فی نسخہ پانچ روپے سے لے کر تیس روپے تک میں فروخت بھی ہوتا رہا!)۔ مولانا عثمانیؒ کے بظاہر حد درجہ سادہ و سلیس حواشی میں راقم کو فکر و نظر کی جو گہرائی اور گیرائی نظر آئی اور خصوصاً احوالِ باطنی کی جو چاشنی یا بالفاظِ دیگر تصوّف کی جو حلاوت محسوس ہوئی

اس سے اس کی نسبتِ قرآنی، کو بفضل اللہ تعالیٰ دعوتِ عرضِ ثالث (THIRD-DIMENSION) عطا ہوگیا ——— اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانۂ طالبعلمی ہی میں اس عاجز و ناکارہ کو نہ صرف یہ کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایک اُنسِ قلبی عطا ہوگیا اور مناسبتِ ذہنی حاصل ہوگئی بلکہ ایک نسبتِ روحانی بھی نصیب ہوگئی اور اس کے پڑھنے اور پڑھانے (تعلیم و تعلّم) کا ایک شدید داعیہ بھی اس کے باطن میں پیدا ہوگیا چنانچہ اوّلاً جمعیتِ طلبہ کے حلقوں میں اور پھر جماعتِ اسلامی کے ساہیوال اور اوکاڑہ کے حلقے میں اس کے 'درسِ قرآن' کا چرچا ہوگیا۔ اور اس کے بارے میں بالعموم ایک خوشگوار حیرت (PLEASANT SURPRISE) کا سا تاثّر ظاہر کیا جانے لگا ——— دورِ طالب علمی کے اختتام کے تقریباً معاً بعد راقم کا تعارف ایک تو ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم سے ان کی تالیف 'قرآن اور علمِ جدید' کی وساطت سے ہوا اور دوسرے ایک بالکل 'دوسرے' علاّمہ اقبال سے ان کے خطبات (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کے حوالے سے۔ اور راقم کو اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ اس سے اس کے مطالعۂ قرآن کو وہ بُعدِ رابع (FOURTH DIMENSION) ملا جس کی اہمیت زمانۂ حال کے اعتبار سے پہلے تینوں اعراض و ابعاد سے کسی طرح کم نہیں ——— اب خواہ اِسے کوئی باندازِ تحقیر راقم کے مطالعۂ قرآن کا 'حدود اربعہ' کہہ لے خواہ بطرزِ استہزا اسے اس کا 'مبلغِ علم' قرار دے لے، بہرحال واقعہ یہی ہے کہ راقم کی قرآنی 'سوچ' کا اصل تانا بانا ان ہی 'ابعادِ اربعہ' سے تیار ہوا ہے جن کی محکم اور پختہ اساسات ۱۹۶۲-۶۱ء کے آس پاس قائم ہو چکی تھیں جبکہ راقم کی عمر کُل تیس برس کے لگ بھگ تھی ———

بعد کے چودہ پندرہ سالوں کے دوران اللہ کا فضل و کرم ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان اساسات میں سے کوئی بھی منہدم تو کجا مضمحل یا شکستہ تک نہیں ہوئی بلکہ بحمداللہ چاروں ہی کو مسلسل تقویت ملتی رہی اور استحکام حاصل ہوتا رہا۔ اور بجائے اس کے کہ: ع

"جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اُسے صاف دل سے بھلا دیا!"

کے مصداق کسی نئے زاویۂ فکر سے متعارف ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پچھلی سوچ اور اس سے حاصل

شدہ نتائج بالکل زائل ہو جاتے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر نیا اندازِ فکر سابق فکر میں ایک ارتقائی شان پیدا کرتا چلا گیا۔ اور یہ عمارت اپنے اطراف و جوانب سمیت بلند ہوتی گئی ــــ اس ہمہ جہتی استحکام و ارتقاء کے ضمن میں واقعہ یہ ہے راقم سب سے بڑھ کر مرہونِ منت ہے علامہ اقبال مرحوم کے فارسی کلام کا۔ جس کے اعتبار سے علامہ موصوف یقیناً 'رومی ثانی' بھی ہیں اور مجسم 'ترجمان القرآن' بھی۔ اور اس سلسلے میں شدید ناانصافی ہوگی اگر ذکر نہ کر دیا جائے کہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران راقم کو فائدہ پہنچا مولانا برکات احمد خاں مرحوم (ٹونکی ثم ساہیوالی) کی ہم نشینی سے اور بعد کے دس سالوں کے دوران فیض حاصل ہوا پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہ، کی صحبت سے۔

الغرض ــــ راقم کے فکر و نظر پر "هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ" کے مصداق ابتدائی اور تکمیلی چھاپ تو ہے علامہ اقبال مرحوم کی ــــ ان میں سے ابتدائی تاثر زیادہ تر جذباتی ہے جس کا حاصل ہے 'جذبۂ ملی' اور تکمیلی رنگ خالص فکری ہے جس کا موضوع ہے فکرِ جدید کے پس منظر میں قرآن حکیم کا مطالعہ یا قرآنِ حکیم کی روشنی میں فکرِ جدید کا جائزہ و تجزیہ ــــ اور ان کے مابین رواں ہیں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کی 'قرآنی دعوتِ جہاد و انقلاب' اور امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے 'طریقِ تدبر قرآن' اور حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے 'علمِ راسخ' کے کوثر و تسنیم ایسے چشمے ــــ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ راقم حیران ہے کہ کس منہ سے اور کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے۔ ایک ان پڑھ یا نیم خواندہ انسان پر جسے اپنی نسبت 'اُمیّت' پر فخر ہے انعامات و اکرامات کی یہ بارش! بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ؎ "اک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارائیں!"

برِ صغیر پاک و ہند کے بیسویں صدی عیسوی کے 'فکرِ قرآنی' کے متذکرہ بالا سلاسلِ اربعہ

کے اعاظمِ رجال اور "سابقون الاوّلون" کی اکثریت کا انتقال تو راقم الحروف کی پیدائش یا شعور کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہو چکا تھا لہٰذا ان کی زیارت سے تو محرومی ہی رہی۔ البتہ ان کے "مُتَّبِعِیْنَ بِاِحْسَانٍ" کی اکثریت کے ساتھ قریبی تعلق بلکہ ذاتی و نجی روابط کی سعادت اس عاجز کو حاصل رہی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال راقم کی پیدائش سے لگ بھگ بارہ سال قبل ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ راقم کا ذہنی و قلبی رشتہ کُل کا کُل "غائبانہ" ہے۔ بایں ہمہ ان کی عظمت کے جو نقوش اس عاجز کے قلب پر کندہ ہیں اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل نظر آتا ہے مختصر یہ کہ راقم کو امامُ الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیتِ کبریٰ کا عکسِ کامل ان کی شخصیت میں نظر آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امامُ الہند کی جامعیت کا مظہر ان کی تصانیف ہیں اور شیخ الہندؒ کی جامعیت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔ اگر یہ اُصول درست ہے اور لازماً درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ذرا پہچاننے کی کوشش کیجیے اس شخص کی عظمت کو جس کا جانشین جہادِ حُریت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں ہوا مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسا مجاہدِ اعظم۔ اور حدیث، فقہ، اُصول اور کلام کے میدان میں ہوا مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ ایسا نابغۂ روزگار انسان۔ اور جس کے فہمِ قرآن اور جذبۂ ملّی کا ظہور ہوا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی عظیم شخصیت میں اور جس کے انقلابی کردار نے رُوپ دھارا مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ایسے سیماب وش انسان کا۔ راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کو ان کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی کما حقہٗ نہیں پہچانا ——— ورنہ ذرا غور کیا جائے تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چودھویں صدی ہجری کے مُجدّد وہ ہیں! ——— واللہ اعلم!

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا انتقال تو اگرچہ راقم کے سنِّ شعور کو پہنچنے کے بعد ہوا لیکن افسوس کہ ان کی زیارت سے بھی محرومی ہی رہی۔ تاہم ایک خیال اطمینانِ قلب کا موجب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ذرّے کو آفتاب سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو اس عاجز کو بھی ان کے ساتھ ایک نسبتِ معنوی حاصل ہے۔ بایں طور کہ جب وہ تحریکِ پاکستان کے صفِ اوّل

کے قائد کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کر رہے تھے تو یہ خاکسار بھی خواہ ایک طفلِ مکتب کی حیثیت ہی سے سہی مشرقی پنجاب کے ایک ضلع (حصار) کے مختلف قصبات (سرسہ، ہانسی وغیرہ) کے ہائی اسکول کے طلبہ کے مابین ایک رابطہ استوار کرنے کی سعی میں مشغول تھا ——— بعدازاں ان کے تفسیری حواشی کی بدولت ان کی جو معنوی صحبت حاصل رہی اس کا ذکر اوپر ہو ہی چکا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کے رفیقِ کار اور معتمدِ خاص مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ملاقات کا شرف البتہ راقم کو حاصل رہا اور ان کی شفقت و محبت سے بھی اس عاجز نے حصہ پایا۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگردِ رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی نیازمندی کی سعادت بھی راقم کو حاصل ہے اور اُن کی شفقت اور نظرِ کرم بھی اس ناچیز کا سرمایۂ افتخار ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض کے دوسرے دو چشموں سے بھی راقم بحمداللہ بیگانہ و نابلد نہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ اور مولانا سندھی مرحوم کے شاگردِ رشید مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلفِ الرشید مولانا عبیداللہ انور کی نیازمندی، اور گاہے گاہے اُن کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی راقم کو حاصل ہے، گویا ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

علامہ اقبال کے انتقال کے وقت بھی راقم کی عمر کُل چھ برس تھی لیکن اب یہ بات خود اس عاجز کو نہایت عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے انتقال کو راقم نے ایک ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔ اِس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں کہ اِس عالمِ فانی میں آنے سے قبل عالمِ ارواح میں جن ارواح کے مابین اُنس پیدا ہو جاتا ہے اُن کے مابین مودّت کا رشتہ اس عالمِ اجساد میں بھی برقرار رہتا ہے ——— بہرحال علامہ مرحوم کے ساتھ راقم کا قلبی تعلق کم و بیش "مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ" والا ہے۔ اور اوپر عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ راقم کے شعور کی تہمتانی

سطحوں میں سے سب سے نچلی تہہ پر نقوش ثبت ہیں علّامہ مرحوم کے اُردو اشعار کے اور اس کے فکر کی بلند ترین سطح پر کندہ ہیں نقوش اُن کے فارسی کلام کے۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کی ملاقات فلسفۂ اقبال کے مدوّن و شارح ، اور 'حکمتِ اقبال' کے مصنف ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم سے ہوئی تو دونوں ہی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے بہت پہلے سے واقف ہیں۔ اور جب بھی کوئی گفتگو ہوئی یہی محسوس ہوا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا — مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ڈھائی سال نہایت قریبی تعلق راقم کو ڈاکٹر صاحب مرحوم سے حاصل رہا۔ ('میثاق' کے اس دَور کے فائل اس پر شاہدِ عادل ہیں!) اُس زمانے میں "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" راقم کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی حرف بحرف تصویب ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اور 'میثاق' کے لیے اپنی تصنیف 'MANIFESTO OF ISLAM' کا ترجمہ اُردو میں خود ہی کرنا شروع کر دیا جس کی چند ہی قسطیں چھپنے پائی تھیں کہ ع

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

والا معاملہ ہو گیا۔ یغفر اللہ لنا و لہٗ و یدخلہ فی رحمتہ ۔

اسی طرح کلامِ اقبال کے شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدّ ظلہ سے جو ذاتی ربط و تعلق ۱۹۶۶ء میں اُستوار ہوا تھا وہ بحمد اللہ نہ صرف یہ کہ آج تک قائم ہے بلکہ اُمید واثق ہے کہ آخر دم تک دائم رہے گا۔ (یہاں تک کہ بعض واقفینِ حال تو واقعتاً حیرت میں ہیں کہ پروفیسر صاحب ایسے نازک طبع اور تنک مزاج بزرگ سے راقم کا تعلق کیسے نبھ رہا ہے!) پروفیسر صاحب نے "نشاۃِ ثانیہ" کی جو مفصّل تائید و تحسین تحریر کی تھی وہ تو اکثر قارئین 'میثاق' کے علم میں ہے ہی زبانی جو کچھ فرمایا اسے اس خوف سے نقل نہیں کر سکتا کہ اسے خود ستائی پر محمول کیا جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ویسے تو ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ لیکن راقم کو جس ابوالکلام سے دلچسپی تھی یا ہے یعنی 'الہلال' اور 'البلاغ' والا ابوالکلام جس کے بارے میں کمال وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا!" وہ واقعتہً ۲۱-۱۹۲۲ء کے لگ بھگ ہی وفات پا چکا تھا اور اس کے معنوی خلیفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جب اس کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تو اُسے بجا طور پر اس کی زندگی ہی میں "مرحوم" قرار دے دیا تھا ——— تاہم مولانا مرحوم کو دیکھنے کی تمنا راقم کے دل میں مستقل طور پر رہی جسے دو ملکوں کے فاصلے نے بالآخر ۱۹۵۸ء میں حسرت میں تبدیل کر دیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولانا مودودی نے مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر کے ہم نام ماہنامے 'ترجمان القرآن' کی ادارت سنبھالی وہی راقم کا سنِ پیدائش ہے۔ اور مولانا آزاد کے انتقال کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جب کم و بیش دس سال کی ہم سفری کے بعد راقم کی راہ مولانا مودودی کے راستے سے جدا ہوئی۔

مولانا مودودی کے ساتھ راقم کے وصل و فصل کی داستان نہایت طویل ہے مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک نہایت قریبی تعلق راقم کو مولانا کے ساتھ حاصل رہا۔ ان میں سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دو سالوں کے دوران جبکہ راقم اسلامی جمعیتِ طلبہ کے صفِ اوّل کے کارکنوں میں سے تھا، مولانا سے قرب کا یہ عالم تھا کہ راقم جب چاہتا تھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر فوری مشورے کے لیے راقم الحروف نے مولانا سے نصف شب کے لگ بھگ اُن کی خوابگاہ میں بھی ملاقات کی۔ ۱۹۵۵ء میں راقم جماعتِ اسلامی کا رکن بنا اور بدقسمتی سے اس کے فوراً بعد ہی اس نے شدّت کے ساتھ محسوس کر لیا کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک اپنی اصل اساسات سے منحرف ہو چکی ہے۔ اواخر ۱۹۵۶ء میں راقم نے اپنا وہ مفصّل بیان سپردِ قلم کیا جو اب 'تحریکِ جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، فروری ۱۹۵۷ء میں اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں راقم نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی۔

اور حالات کی ستم ظریفی نے اس وقت صورت کچھ ایسی پیدا کر دی کہ گویا مودودی صاحب 'لیڈر آف دی ہاؤس' تھے اور یہ خاکسار 'لیڈر آف دی اپوزیشن'! چنانچہ راؤ خورشید علی خاں صاحب نے جو اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کے قائدین میں سے تھے اور اب پیپلز پارٹی کے رُکن اور نیشنل اسمبلی کے ممبر ہیں، بھرے اجلاس میں باقاعدہ یہ الفاظ کہے بھی تھے کہ "ڈاکٹر اسرار کو لیڈر آف دی اپوزیشن کی حیثیت حاصل ہے انہیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے پورا وقت ملنا چاہیئے!" ——— بہر نوع اپریل ۱۹۵۷ء میں راقم نے جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس طرح وہ دس سالہ تعلق ختم ہو گیا ——— اب اس 'فصل' کو بھی بیس برس ہونے کو آئے ہیں، اور اس دوران میں بھی اُونچ نیچ کے بہت سے ادوار آئے لیکن ان سب کا حاصل یہ ہے کہ ؎

بس اتنا سا تعلق اب اُن سے رہ گیا ہے ۔۔۔ وہ مجھ کو جانتے ہیں مَیں اُن کو جانتا ہوں

آج سے تقریباً دس سال قبل جب رحیم یار خاں میں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے چند حضرات کے اجتماع میں "ایک نئی اسلامی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ راقم نے بعض معروضات 'میثاق' کے صفحات میں مولانا مودودی کی خدمت میں پیش کی تھیں ——— راقم کے احساسات اب بھی بالکل وہی ہیں اور اب جبکہ 'تنظیمِ اسلامی' کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ دوبارہ تشکیل پا کر سفر کا آغاز کر چکا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان معروضات کو من و عن دہرا دیا جائے ——— وَھُوَ ھٰذَا :

"اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گذارش راقم الحروف جماعتِ اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران، راقم الحروف کے بعض اقدامات اور اس کی بعض تحریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہو گی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دل آزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہارِ دینِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمرِ عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جدوجہد

کی نذر کئے۔ پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رُخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں اپنے خیالات کو قلم بند کیا اور آپ سے درخواست کی کہ "اپنی تو کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس کا واسطہ دے سکوں، آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو پڑھ ضرور لیں"۔۔۔۔۔ ماچھی گوٹھ کے بھرے اجتماع میں سٹیج پر اعلان کیا کہ: "اگرچہ مجھے اپنے موقف کی صحت کا یقین ہے اور امیرِ جماعت کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ تاہم میں جماعت میں شامل رہوں گا اس لیے کہ اس کے بغیر میں اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔ لیکن پھر جب کچھ آپ کی عنایتوں میں مزید اضافہ ہوا اور آپ نے اہلِ اختلاف پر ضعفِ ارادۂ بسیط اور ضعفِ ارادۂ مرکّب کی پھبتیاں چست کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہوا کہ جماعت میں عضوِ معطّل کی حیثیت سے رہنا آخر چہ سود؟ تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی کہ: میں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبت کا تعلّق رکھتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبورًا اس لیے آمادہ ہو گیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا"! علیحدہ ہونے کے بعد بھی کم و بیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلّق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس قلبی کیفیّت کا اظہار بھی کیا تھا۔ افسوس کہ اس کے فورًا بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک غلافِ کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط و تعلّق کی بدولت دل کی یہ کیفیّت برقرار نہ رہ سکی اور ذہنی دوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُعد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصّے کی بھی آمیزش تھی۔ اس کے "خلافت و ملوکیّت" لکھ کر عمر کے آخری حصّے میں جو کمائی آپ نے کی ہے اُس کی وجہ

سے غصّے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کانپنے لگتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ :——
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ بایں ہمہ ! اب جب کہ ہم آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیازمند دین کی چھوٹی بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کے لیے اُٹھ رہے ہیں - اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے - اگرچہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" کی رُو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں اُن پر لامحالہ تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا - . . . "

مولانا حمید الدّین فراہیؒ کا انتقال بھی راقم کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہو گیا تھا - اور غالباً ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء تک راقم مولانا کے نام تک سے واقف نہ تھا - بعد میں جب مولانا امین احسن اصلاحی کی وساطت سے ان سے تعارف ہوا اور ان کی تحریریں بھی دیکھنے میں آئیں اور اُن کے حالاتِ زندگی بھی معلوم ہوئے تو اندازہ ہوا کہ واقعۃً ایک نہایت عظیم ہستی تھی جو نہایت خاموشی کے ساتھ قرآنِ حکیم پر غور و فکر اور تدبّر و تفکّر کی ایک بالکل نئی طرح ڈال کر رخصت ہو گئی - اُن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ راقم الحروف کے تصوّر میں اُبھرتا ہے وہ سُقراط سے بہت مشابہ ہے - ایک حکیم و دانا اور نیک و پارسا انسان جو لوگوں کی تعریف و تحسین اور تنقید و ملامت دونوں سے یکساں بے نیاز ہو اور یا تو خاموش تعقّل و تفکّر میں غرق ہو یا اپنے چند شاگردوں کو نہایت دھیمے طریق پر اور مکالمے کے سے انداز میں اس طرح درس دے رہا ہو جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی اُنگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا ہے ——— اور راقم اسے اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اسے حکیم فراہیؒ کا نہ سہی اُن کے شاگردِ رشید کا قُرب تقریباً رُبع صدی تک حاصل رہا -

مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعلّق کا آغاز تو مولانا مودودی کی طرح ۴۷ء

ہی میں ہوگیا تھا۔ (بلکہ راقم نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کو پہلی بار ۱۹۴۷ء میں دارالاسلام پٹھانکوٹ میں دیکھا تھا! جہاں وہ اپنے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیّت میں حاضر ہوا تھا) لیکن ۱۹۵۱ء تک یہ تعلّق کُلّیتہً یک طرفہ تھا یعنی صرف ان کی تقریریں اور درس سُن لینے تک محدود تھا۔ تا آنکہ اب سے ٹھیک پچیس سال قبل نومبر ۱۹۵۱ء کی ایک شام کو وائی، ایم، سی، اے ہال لاہور میں راقم نے اسلامی جمعیّت طلبہ پاکستان کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر مولانا کے زیرِ صدارت اپنی وہ پہلی عوامی تقریر کی جو اب تک جمعیّت کے دعوتی لٹریچر کا اہم جزو ہے اور "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے طبع ہوتی ہے۔ راقم کی اس تقریر کی تعریف و تحسین مولانا نے دل کھول کر فرمائی ——— اور یہیں سے وہ 'یک طرفہ تعلّق' باقاعدہ 'دوطرفہ تعلّقات' میں تبدیل ہوگیا ——— دسمبر ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۲ء میں جمعیّتہ طلبار کی دو تربیت گاہوں میں راقم ناظم کی حیثیّت سے شریک رہا اور مولانا معلّم و مربّی کی حیثیّت سے، اس سے ان تعلّقات کی گہرائی و گیرائی میں نمایاں اضافہ ہوا ——— بعد کے چار سالوں کے دوران میں بے تکلّف ملاقاتوں سے یہ تعلّق مزید اُستوار رہا ——— ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نے راقم کے متذکرہ بالا اختلافی بیان کی نہایت شاندار الفاظ میں تصویب و تائید کی۔ اس طرح جماعت میں پالیسی کے بارے میں جو اختلافِ رائے ہوا اس کے ضمن میں بھی ع "ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز" کے مصداق مولانا اور راقم ایک ہی صف میں شامل ہوگئے ——— ۱۹۵۸ء میں جب مولانا نے بھی جماعت کو خیر باد کہہ دیا اور کسی نئی تعمیر کی فکر میں 'مشاورتوں' کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی مسلسل ساتھ رہا۔ اور اس سلسلے کا اہم ترین اجتماع عزیز تینیر سنز ہٹریہ میں راقم ہی کے زیرِ اہتمام غالباً چار روز تک جاری رہا لیکن افسوس کہ کوئی متفق علیہ نقشہ نہ بن سکا[۱] ۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں راقم ان مشاورتوں کی مسلسل ناکامی سے بد دل سا ہو کر ڈاکٹر مسعود الدّین حسن عثمانی کی دعوت پر بغیر مولانا کو اطّلاع دیئے کراچی منتقل ہوگیا تو ایک حد درجہ محبّت بھرا شکوہ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں کیا:

(۱) حاشیہ اگلے صفحہ پر

"آپ کے اس خفیہ اقدام کی اطلاع سیال صاحب سے مجھے ہو چکی تھی۔ بہر حال جو کچھ آپ نے کیا اچھا کیا۔ خدا کرے آپ کے مقاصد وہاں پورے ہوں اور آپ کو وہاں دلجمعی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کی فرصت ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ان شاء اللہ آپ کے لیے موجبِ خیر و برکت ہوگی۔ فرزانوں کے ساتھ نباہ مشکل ہوتا ہے، دیوانے گذارے جاتے ہیں۔ آپ دونوں دیوانے ہیں۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو ـــ مجھے جو احساس ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھ سے دور ہو گئے۔ آپ سے ایک قلبی لگاؤ سا ہو گیا ہے، اس وجہ سے اس بات سے تھوڑی سی تکلیف ہے کہ میں نے جتنا ہی کھینچنا چاہا اتنے ہی آپ کھنچتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کھنچتے کھنچتے کراچی پہنچ گئے۔ خیر صاحب، جہاں رہو سلامت رہو اور دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھو!......"

۱۹۵۹ء میں اس خیال سے کہ محض ایک سابقہ تعلق کی بنیاد پر نئی تعمیر ممکن نہیں ـــ
ں کی فکری اساسات کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا جانا چاہیے۔ مولانا نے ماہنامہ 'میثاق'
ری فرمایا تو، جیسا کہ پہلے بھی ایک موقع پر عرض کیا جا چکا ہے، راقم اس کے اوّلین معاونین
ں بھی شامل تھا اور بعد میں بھی مقدور بھر اعانت کرتا رہا اور دوسری طرف کراچی سے خالد
احب مرحوم کی علالت کے باعث واپسی پر ۱۹۶۰ء راقم نے منٹگمری (حال ساہیوال)

ے ان 'مشاورتوں' پر ایک نہایت دلچسپ پھبتی اس زمانے میں ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے چست کی تھی۔ ہوا یوں کہ ملک صاحب علیل تھے، راقم اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف ان کی عیادت کے لیے ن کے پارک لین، ٹمپل روڈ والے مکان میں حاضر ہوئے، تو باتوں باتوں میں ان 'مشاورتوں' کا ذکر ی آگیا۔ اس پر ملک صاحب نے یہ لطیفہ سنایا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب نے اپنے خلفاءِ مجاز کی ایک شاورت طلب فرمائی، اور مشورہ طلب بات یہ پیش کی کہ کلہ "عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد" آپ وں کا کیا خیال ہے، کیا ہم اس کا اعادہ نہ کر دیں؟ ـــ سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی، سی نے اثبات میں کسی نے نفی میں، ایک صاحب خاموش رہے۔ حضرت نے ان سے براہِ راست استفسار یا تو انہوں نے مؤدبانہ گذارش کی کہ "حضرت میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا منصور نے بھی وہ اقدام کسی ے مشورہ لے کر کیا تھا!"

میں ایک اسلامی ہاسٹل قائم کیا اور حلقۂ مطالعہ قرآن کی داغ بیل ڈالی تو مولانا نے راقم کے ان کاموں میں بھرپور تعاون فرمایا۔ ہاسٹل کی تجویز پر ایک مفصل تائیدی شذرہ 'میثاق' میں تحریر فرمایا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن منٹگمری کی دعوت پر تقریر کے لیے دوبار ساہیوال کے سفر کی زحمت برداشت کی!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک تقریباً چار سال راقم نے دوبارہ ایک دوسرے سلسلے میں کراچی میں بسر کیے۔ اور اس عرصے میں راقم کا رابطہ مولانا سے بہت کم رہا۔ مولانا نے اس دوران میں بعض دوسرے احباب کے ساتھ مل کر 'مجلس دعوت و اصلاح' کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن نہ تو یہ بیل ہی منڈھے چڑھی نہ ہی اجتماعی کام کا کوئی اور نقشہ تیار ہو سکا۔ اس سے بددل ہو کر مولانا نے ذاتی طور پر 'حلقۂ تدبر قرآن' قائم فرمایا اور اپنی ساری توجہات چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دیں۔ دوسرے احباب سے ان دنوں مولانا کا رابطہ کمزور پڑتے پڑتے معدوم کے حکم میں آ گیا۔ جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ 'میثاق' نے پہلے تو کچھ عرصے تک ہچکیاں لیں اور بالآخر بالکل دم توڑ دیا ——— یہ حالات تھے جب راقم ۱۹۶۶ء میں دوبارہ وارد لاہور ہوا۔ میثاق بند پڑا تھا، تفسیر کی جلد اوّل تیار تھی لیکن اس کی طباعت و اشاعت کی کوئی سبیل دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی۔ 'حلقۂ تدبر قرآن' میں جن نوجوانوں پر مولانا نے شدید محنت کی تھی وہ سب بسلسلۂ روزگار تتر بتر ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کسی ٹریننگ کے سلسلے میں انگلستان جا چکے تھے دوسرے صاحب کا تبادلہ ڈھاکہ میں ہو گیا تھا۔ بعض دوسرے لوگ بددل ہو گئے تھے ——— الغرض بالکل ع

"دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"

والا سماں تھا ——— خود راقم کے سامنے لاہور نقلِ مکانی میں دو مقصد تھے: ایک 'حلقۂ تدبر قرآن' میں شرکت اور مولانا کے سامنے باضابطہ زانوئے تلمذ تہ کر کے ان سے استفادہ اور دوسرے اس اصل تحریک اسلامی کے احیاء کی سعی جو راقم کے خیال کے مطابق جماعتِ اسلامی کے انتقالِ موقف کے باعث مردہ ہو چکی تھی ——— لاہور آ کر اندازہ ہوا کہ مولانا 'حلقۂ تدبر قرآن' سے بددل ہو چکے ہیں اور اس منہج پر از سرِ نو محنت کی

ہمّت اپنے اندر نہیں پاتے ـــــ اور اب سارا وقت اور ساری محنت تفسیر کی تسوید پر صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا راقم کا پہلا مقصد تو فوت ہو گیا۔ لیکن ہمّت کر کے 'تدبّر قرآن' کی جلد اوّل اس نے شائع کر دی اور مولاناؒ نے ازراہِ شفقت اس زمانے میں برملا نہ صرف راقم سے کہا بلکہ دوسرے بہت سے احباب و رفقاء کے سامنے فرمایا کہ 'یہ اس کا مجھ پر ذاتی احسان ہے'! راقم کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر جلد اوّل شائع نہ ہوئی تو آگے لکھنے پہ مولانا کی طبیعت مائل نہیں ہو گی اور یہ کام ادھورا رہ جائے گا ـــــ

دوسرے مقصد کے ضمن میں راقم نے اوّلاً مولوی محی الدّین سلفی مرحوم کی تحریک پر اور ان کے تعاون سے اپنا اختلافی بیان "تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور بعد ازاں ایک باضابطہ دعوت کے آغاز کے لیے 'الرّسالہ' کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ مولانا کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی نیا رسالہ جاری کرنے کی بجائے 'میثاق' ہی سنبھال لو، میں تو اسے جاری نہیں رکھ سکتا۔ تم شائع کرتے رہو گے تو کم از کم اس کا نام تو رہے گا۔ 'اِمْتِثَالاً لِلْاَمْر' راقم نے بہت دوڑ دھوپ سے حاصل کیا ہوا ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور اگست ۱۹۶۶ء سے "زیرِ سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" 'میثاق' کی ادارت سنبھال لی۔

۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے دوران 'میثاق' کے ذریعے راقم نے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی میں جو اختلافِ رائے واقع ہوا تھا اس کی اصل نوعیّت کیا تھی اور علیحدہ ہونے والے علیحدگی اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کر دیئے گئے تھے ـــــ اور دوسری طرف علیحدہ ہونے والوں کو للکارا کہ اگر وہ جماعتِ اسلامی میں کسی شخصی عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ 'فریضۂ اقامتِ دین' کی ادائیگی کے لیے شامل ہوئے تھے تو جماعت سے علیحدگی سے وہ فرض تو ساقط نہیں ہو گیا۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے مجتمع ہو کر جدّ و جہد کریں۔ اس کا بحمداللہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اواخر ۱۹۶۷ء میں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے بعض احباب کا ایک اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا جس میں "ایک نئی دینی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ

کر لیا گیا۔ اس اجتماع میں مولانا بھی شریک تھے اور انہوں نے اس موقع پر بھی حسبِ عادت نہایت فراخدلی سے ان لوگوں کو خراجِ تحسین اور ہدیۂ تشکر ادا کیا تھا جنہوں نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مندرجۂ ذیل الفاظ راقم نے ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' کے کور پہ نمایاں حیثیت سے شائع کئے تھے:

"عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمّت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔

میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت، اور اہمیّت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی کسی ذمّہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے آخری دَور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اسی پر صرف کرنا چاہتا تھا چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمّت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیّت کی طرف توجّہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں۔ تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام

دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اس عظیم فرض کی اہمیّت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔"

"امین احسن اصلاحی"

لیکن افسوس کہ سابقہ تمام مساعی کی طرح یہ کوشش بھی، بالکل ع

"چلنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!" کے سے انداز میں ناکام ہو کر رہ گئی۔

یہ دَور راقم کی زندگی میں ایک اہم موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس وقت راقم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کسی 'بڑے' کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اور کوئی چلے نہ چلے اور ساتھ دے نہ دے تن تنہا چلنا پڑا تب بھی سفر کا آغاز بہرحال کرنا ہے۔ گویا ۴۷ء تا ۱۹۵۷ء دس سال مولانا مودودی کے ساتھ اور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء، دس سال مولانا اصلاحی کے ساتھ راقم کلّیۃً وکاملۃً وابستہ رہا۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے (لگ بھگ چھتّیس برس کی عمر میں) اس نے آزادی کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم بحمداللہ، راقم اپنے ماضی سے منقطع نہیں ہوا اور اس نے ایک جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن پر اپنی تمام تر مساعی صرف کر دیں اور ان کے ذریعے اصلاً قرآن کی اس انقلابی دعوت کا پرچار کیا۔ جس کے برّعظیم میں موجودہ صدی کے داعئ اوّل تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور جس کے تسلسل کو برقرار رکھّا تھا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسری جانب 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے ذریعے اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو کھپا دیا مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کی تصانیف کی اشاعت کے ذریعے تدبّرِ قرآن کے اس اسلوب کی ترویج و اشاعت میں جس کے بانی ہیں مولانا حمیدالدین فراہیؒ اور شارح ہیں مولانا امین احسن اصلاحی —— لیکن اب چونکہ راقم کسی ایک لکیر کا فقیر نہیں رہا تھا لہٰذا اس کی 'سوچ' کے دوسرے اجزائے ترکیبی بھی سامنے آنے لگے۔ اور ۱۹۶۸ء سے 'میثاق' میں 'افاداتِ فراہیؒ' اور 'تدبّرِ قرآن' کے ساتھ ساتھ جگہ ملنے لگی نہ صرف مولانا سندھی مرحوم کے تذکرے اور ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم کے 'منشورِ اسلام' کو بلکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے "ربّانیّۃ لا رھبانیّۃ" اور

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے "حقیقتِ تصوّف" اور "تاریخ تصوّفِ اسلامی" ایسے مضامین کو بھی۔ اور یہی چیز سببِ اوّل بن گئی مولانا اصلاحی کی راقم الحروف کی جانب سے گرانیٔ طبع کی۔ اس لیے کہ مولانا برملا فرمایا کرتے ہیں کہ "میں تصوّف کو کُل کا کُل ضلالت و گمراہی سمجھتا ہوں" چنانچہ مولانا نے راقم سے مشفقانہ انداز میں فرمانا شروع کیا کہ "عزیزم! تمہارے بارے میں مجھے دو اندیشے لاحق ہیں۔ ایک یہ کہ تم انتہائی ذہین ہو اور دوسرے یہ کہ تمہارے اندر تصوّف کی لٹک موجود ہے!" راقم اسے ہنس کر ٹال دیتا رہا اور مولانا کی مروّت و شرافت کہ وہ تعلّقات کو (اپنے بعض شاگردوں اور احباب کی شدید سرگرانی کے علی الرغم) نباہتے رہے!

۷۵-۱۹۷۴ء کے دوران اُدھر تو مولانا علیل ہوگئے اور ان کی علالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور اِدھر راقم کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن وسعت اختیار کر گئے اور اُس کے اعوان و انصار کا ایک خاصا بڑا حلقہ وجود میں آگیا اور بالکل فطری طور پر کسی باقاعدہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے تحت کم از کم مالی اُمور منضبط کئے جا سکیں۔ یہی ضرورت تھی جس کے تحت 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ راقم اس سے بہت پہلے گہرے غور و خوض کے بعد اس حتمی نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ کسی دینی تنظیم میں شورائیت اس جمہوری طرز کی نہیں ہونی چاہیے جس میں بقول علامہ اقبال مرحوم ؎ "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" بلکہ اُس طرز کی ہونی چاہیے جو اسلام کے نظامِ امارت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ جس میں امیر صرف دستوری صدر نہیں بلکہ صاحبِ امر ہوتا ہے۔ چنانچہ بلاخوفِ لومۃ لائم راقم نے اپنے اس خیال کو تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں بیان بھی کیا اور انجمن کا مجوّزہ دستوری خاکہ بھی اسی نہج پر تیار کیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جیسے ہی یہ ڈھانچہ 'میثاق' میں شائع ہوا، مولانا بھی بفضلہ تعالےٰ صحتیاب ہوگئے۔ اب جو ان کے علم میں یہ خاکہ آیا تو وہ سخت برہم ہوئے اس لئے کہ اس معاملے میں بھی راقم کی اور ان کی رائے کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ نتیجۃً وہ دو طرفہ تعلّقات جو بیس سال نہایت خوشگوار چلے آرہے تھے ایک شدید بحران (CRISIS) سے دوچار ہوگئے۔ بعض احباب نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن

نے صاف عرض کر دیا کہ اُس کی بھی یہ سوچی سمجھی رائے ہے اور اب اس میں تبدیلی صرف طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اسے دلیل سے قائل کر دیا جائے۔ محض پاسِ ادب اور بزرگی کی بنا پر وہ اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ "ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِی بَیْنِكَ" کا آغاز ہو گیا اور اس کے پہلے قدم کے طور پر طے پایا کہ 'میثاق' کے ورق پر سے "زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" کے الفاظ حذف کر دیئے ئیں۔ تاہم یہ مولانا کی عالی ظرفی ہے کہ اس کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ذاتی تعلقات قرار رہے بلکہ جزوی تعاون بھی جاری رہا۔

مارچ ۱۹۷۴ء سے انجمن خدام القرآن کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اس میں راقم نے تقریباً تمام مکاتب فکر کے علماء کو صدارت یا خطاب کے لئے عوت دی جسے ان کی اکثریت نے ازراہِ شفقت و عنایت منظور فرما لیا۔ یہ چیز راقم کے اور مولانا کے مابین مزید بُعد و فصل کا سبب بن گئی۔ ان کا فرمانا یہ تھا کہ "ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان ہی کے خیالات و تصورات کی تو ہمیں تردید کرنی ہے!" راقم نے اسے ۔ ی خاموشی سے سنا ان سنا کر دیا اس لئے کہ اُس کی طبیعت کا رُخ جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان ہو چکا، بالکل دُوسرا ہے۔ تاہم اُس نے محسوس کر لیا کہ اب مولانا کے مزاج میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے۔

جولائی ۱۹۷۴ء میں راقم نے اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ چھوٹی سی تحریکِ اسلامی جس کا آغاز 'دعوتِ رجوع الی القرآن' سے ہوا تھا اور جس نے پہلی تنظیمی ہیئت 'انجمن خدام القرآن' کی صورت میں اختیار کی تھی اگلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھے اور ٹھیٹھ دینی اصولوں پر جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس کا ہیولیٰ راقم کے پیشِ نظر وہی تھا جو ۱۹۶۷ء میں اجتماع رحیم یار خاں میں طے پایا تھا۔ چنانچہ 'میثاق' کی ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۱۹۷۴ء کی اشاعتوں میں راقم نے اپنی جولائی ۱۹۷۴ء والی تقریر اور تنظیم اسلامی کا ۱۹۶۷ء والا خاکہ ایک طویل ادارئیے سمیت شائع کر دیا۔

اس موقع پر راقم مولانا کی خدمت میں ان کے گاؤں (رحمٰن آباد) حاضر ہوا تو مولانا نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ——— پرچہ کل ہی ملا تھا، میں نے رات ہی پورا پڑھ ڈالا۔ اور رات کے دو بجے تک لالٹین کی روشنی میں اسے پڑھتا رہا۔

تم نے خلا کی نشاندہی بالکل صحیح کر دی ہے۔ اور کرنے کا کام بھی ٹھیک متعین کر دیا ہے البتہ تم نے بہت بھاری بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمت نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ تم نے بوجھ اٹھا ہی لیا ہے تو میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب کرے ـــــ اس لئے کہ میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اگر خود کوئی کام نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو کرتا بھی نہیں دیکھ سکتے . . . . .

مولانا کا یہی وہ حوصلہ افزا طرزِ عمل تھا جس سے راقم کو جرأت ہوئی کہ مارچ ۷۵ء میں جب تنظیم اسلامی کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا دستور طے پایا تو اس میں ایک 'حلقۂ مستشارین' بھی رکھا گیا۔ جس کی زبانی اطلاع پر مولانا نے شیخ جمیل الرحمان صاحب اور کراچی کے بعض دوسرے رفقاء سے یہ فرمایا کہ "آپ لوگوں نے یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے یہ خدمت میں بخوشی سرانجام دوں گا" ـــ لیکن جب باقاعدہ تحریری صورت میں وہ خاکہ اُن کے سامنے آیا تو انہوں نے اس میں شمولیت سے انکار فرمایا۔ یہاں مناسب ہے کہ دستور تنظیم اسلامی کی وہ دفعہ پوری کی پوری نقل کر دی جائے۔ وَھُوَ ھٰذَا :-

"دفعہ - ۵ حلقہ مستشارین

(الف) ایسے اصحابِ علم و فضل پر مشتمل ایک حلقہ مستشارین قائم کیا جائے گا جو کسی سبب سے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ تو شریک نہ ہوں البتہ اس کے نظریات سے مجموعی اور اس کے مقاصد سے عمومی دلچسپی رکھتے ہوں اور یہ ذمہ داری قبول کر لیں کہ عند الطلب مشورہ بھی دیتے رہیں گے اور تنظیم کی جملہ سرگرمیوں پر نگاہ بھی رکھیں گے اور اگر کہیں غلط رجحان نظر آیا تو اس پر متنبہ کر دیں گے۔

(ب) اس حلقے میں صرف وہی اہل علم و فضل شرکت کر سکیں گے جن سے تنظیم خود درخواست کرے۔

(ج) اس حلقے کے کوئی صاحب اگر کوئی غلط رجحان دیکھیں تو وہ اوّلاً داعی تنظیم کو متوجہ کریں گے اور بعد ازاں اگر ضرورت محسوس کریں تو ان کی رائے جملہ رفقائے تنظیم کے علم میں لانا ناظم عمومی کی ذمہ داری ہو گی۔ خواہ تنظیم کے کسی

آرگن میں اشاعت کے ذریعے ہو خواہ کسی سرکلر وغیرہ کے ذریعے "
مولانا کے انکار پر راقم نے مولانا کو خط میں لکھا کہ "میں آپ کو مجبور تو ہرگز نہیں
سکتا لیکن یہ بات کہ تنظیم کا ایک حلقہ مستشارین ہو اور اُس میں آپ نہ ہوں مجھے
ارا نہیں"۔ لہٰذا راقم نے رفقائے تنظیم کے مشورے سے حلقہ مستشارین ہی کو
اقط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد بھی لگ بھگ ایک سال تک مولانا کی خدمت میں راقم کی حاضری
سلسلہ جاری رہا۔ جنوری ۷۶ء میں 'قرآن اکیڈمی' کی تعمیر کے آغاز کا مرحلہ
یا اور ساتھیوں نے اس موقع پر ایک اجتماعی دعا کا پروگرام بنایا تو اُس میں شرکت
ی دعوت راقم نے مولانا کو بھی دی۔ جسے انہوں نے کمال شفقت و مروّت سے منظور
رمالیا۔ اور وہ برادرم نعمان علی صاحب کی معیت میں تشریف لائے۔ لیکن بعد میں بعض
عزات سے سننے میں آیا کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ "میری طبیعت بالکل آمادہ نہ تھی
لیکن جب اُس نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا اور مجبوراً شریک ہو گیا"۔ راقم کی اصل مشکل
تھی کہ مولانا سے ملنا جلنا بھی ہو اور پھر انہیں اپنے کاموں میں شرکت کی دعوت نہ
ی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رہے سہے تعلق کو خود راقم نے ختم کر دیا ——
سی پس منظر میں راقم نے مارچ ۷۶ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت
کی دعوت مولانا کو دی اور حسبِ سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرما لیا لیکن بعد میں
نے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر شرکت سے انکار کر دیا —— یہ
گویا ان دو طرفہ تعلقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور راقم
نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ
وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار نہ ہوں۔ اور اس طرح
ربع صدی پر پھیلے ہوئے وہ تعلقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال
نہایت گرم جوشی کے ساتھ قائم رہے اور بعد ازاں ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت
عظیم تھی"، کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ اب
آٹھ ماہ سے صورت وہی پیدا ہو چکی ہے کہ ؎

بس اتنا سا تعلق اب ان سے رہ گیا ہے — وہ مجھ کو جانتے ہیں، میں ان کو جانتا ہوں!

یہ طویل داستان ہماری موجودہ بحث کے اعتبار سے یقیناً جملۂ معترضہ کے حکم میں ہے۔ لیکن اسے بتمام وکمال اس لئے بیان کر دیا گیا کہ ادھر کچھ عرصے سے راقم سن رہا ہے کہ مولانا کو یہ تشویش ہے کہ راقم ان کا نام استعمال کر رہا ہے اور حال ہی میں ماہر القادری صاحب نے بھی، فاران، میں مولانا کا یہ "سنا سنایا،" جملہ نقل کر کے کہ "مجھے ڈاکٹر اسرار نے EXPLOIT کیا ہے!" درحقیقت راقم اور مولانا کے مابین اختلاف کو خود اپنے مذمومہ مقاصد کے لئے EXPLOIT کرنے کی کوشش کی ہے ـــــــ تو جو جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ ان سطور کا عاجز و ناکارہ راقم مولانا کی نظر عنایت سے قطعاً محروم ہو چکا ہے۔ مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے۔ اور اس ضمن میں بھی تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ مولانا نے تدبر قرآن کی پانچویں جلد کے حقوق طباعت جو مارچ ۱۹۷۶ء میں انجمن کو فروخت کئے تھے واپس لے لئے ہیں اور اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام اب وہ خود فرمائیں گے لہٰذا اس ضمن میں جسے بھی کوئی رابطہ قائم کرنا ہو وہ ان ہی سے کرے!

عربی کا ایک مشہور شعر ہے :

إِنَّ الْفَتَىٰ مَنْ يَقُولُ هَا أَنَا ذَا ۔۔۔ لَيْسَ الْفَتَىٰ مَنْ يَقُولُ كَانَ أَبِي!

تو راقم کو تو اگرچہ فتوّت کا کوئی دعویٰ سرے سے ہے ہی نہیں۔ تاہم اس نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی خوش بختیوں اور محرومیوں کی مفصل داستان اوپر رقم کر دی ہے بلکہ اپنے فکری "آباء و اجداد" کی پوری تفصیل بھی بیان کر دی ہے :

افسوس اس کا ہے کہ ہمارے یہاں دوسرے تمام حقوق کے مانند "اختلاف رائے" کا حق بھی مانگتے تو سب ہیں دینے کو کوئی تیار نہیں اور ہر بڑا شخص "دوانا ولا غیری" کے سے انداز میں کُلی متابعت اور کامل پیروی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں اوپر علماء کرام کے بارے میں مولانا اصلاحی کا قول تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ مولانا بنوری صاحب نے بھی ایک بار فرمایا کہ "ذاتی حیثیت میں آپ مجھے بہت عزیز ہیں، آپ جب بھی مشورہ طلب کریں گے میں پوری توجہ کروں گا۔

لیکن تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں شرکت سے میں اس لئے معذور رہوں کہ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے میرے پاس نہ فرصت ہے نہ صحت ـــــ ویسے یہ بات بھی ہے کہ آپ مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ہم ان کے معلّم اوّل امام ابن تیمیہؒ کو علم کا بحرِ ذخار ماننے کے باوجود اہمیت نہیں دیتے تو ان لوگوں کی تو حیثیت ہی کیا ہے!"

نتیجہ یہ ہے کہ علماء کرام راقم سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ اس دور کا اصل "ترجمان القرآن"، علامہ اقبال کو کیوں قرار دیتا ہے۔ اور علامہ مرحوم کے عقیدتمند اس لئے خفا ہیں کہ وہ ان کے نام کے ساتھ "حضرت"، اور "رحمۃ اللہ علیہ"، کے سابقے اور لاحقے کیوں نہیں لکھتا اور بولتا۔ تھانوی حلقے اس لئے ناراض ہیں کہ شخصاً راقم کی اصل عقیدت مولانا محمود حسنؒ اور مولانا مدنی رحمہ سے ہے اور حضرت مدنیؒ کے عقیدتمند اس لئے خفا ہیں کہ راقم اُن کی سیاسی حکمتِ عملی پر کیوں تنقید کرتا ہے۔

الغرض معاملہ وہ ہے کہ

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش ۔۔۔ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

مزید برآں احناف کے نزدیک راقم "وہابی"، ہے اور اہلحدیث حضرات کے نزدیک "حنفی"، ـــــ گویا ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا ۔۔۔ اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!

اور نوبت بایں جا رسید کہ منکرِ حدیث ہونے کی تہمت تو خاصے عرصے سے لگ ہی رہی تھی، اب سننے میں آیا ہے کہ اس خاکسار کے قادیانی ہونے کی خبر بھی بعض حضرات نے اہتمام کے ساتھ دُور دُور تک پہنچائی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

راقم کے لئے اس صورتِ حال میں دو ہری نوید ہے۔ ایک تو اس کی کہ اس میں اسے "وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا"، (آل عمران: ۱۸۶) کا عکس نظر آتا ہے اور دوسرے اس کی کہ یہ علامت ہے اس بات کی کہ راقم کی مساعی بار آور ہو رہی ہیں اور اس کی دعوت کا حلقۂ اثر وسیع ہو رہا ہے یہ مخالفتیں اور دشنام

طرازیاں تو گویا اس راہ کے ابتدائی سنگ ہائے میل اور نشانات راہ ہیں ــــ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ــــ (الاحزاب : ۲۲) رہی بزرگوں کی نگاہِ التفات اور نظرِ کرم سے محرومی تو اس باب میں بھی راقم مطمئن ہے کہ ؎

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا ۔۔۔ میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں! (اکبر)

ویسے راقم بحمداللہ حضرتِ اکبر ہی کے اس شعر کہ ؎

دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا ۔۔۔ عالم ہے ان گلوں میں پھولوں میں بستیاں ہیں!

اور فیض کے اس شعر کہ ؎

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن ۔۔۔ یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے!

اور اقبال کے اس شعر کہ ۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ۔۔۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

کے مصداق بالکل یکہ و تنہا بھی نہیں ہے ۔ بلکہ اسے اللہ نے ہمراہیوں اور ہمسفروں کی ایک معتدبہ تعداد اور اعوان و انصار کی اچھی بھلی جمعیت عطا فرما دی ہے اور اس کی دس سالہ مساعی کو ربّ العٰلمین نے اس درجہ بار آور کیا ہے اور ایسا شرف قبول عطا فرمایا ہے کہ راقم خود حیران ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ راقم پر علامہ اقبال کے ان اشعار کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں ۔۔۔ راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں ۔۔۔ جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں ۔۔۔ ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

اور ؎ نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے ۔۔۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

چنانچہ لاہور، کراچی اور سکھر تو راقم کی دعوتِ قرآنی اور درسِ قرآن کے بڑے مراکز رہے ہی ہیں، گذشتہ دس سالوں کے دوران راقم اس پیغام کو لے کر ایک جانب گوجرانوالہ، شیخوپورہ، وزیرآباد، گجرات، جہلم، سرگودھا، جوہرآباد، راولپنڈی، اسلام آباد، واہ، ٹیکسلا اور تربیلہ تک گیا ہے اور دوسری جانب

ساہیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یارخاں، صادق آباد، حیدرآباد اور کوئٹہ تک، ــــــ اور نہ صرف یہ کہ تین عظیم الشان سالانہ قرآن کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں بلکہ لاہور اور کراچی میں دو دو بار، اور کوئٹہ اور راولپنڈی میں ایک ایک بار قرآنی تربیت گاہیں قائم کی جا چکی ہیں ــــــ اور ان پر مستزاد ہیں سلسلۂ مطبوعات[1] کے ذریعے دعوتِ قرآنی کی توسیع اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کی توجہات کو قرآن حکیم کے جانب منعطف کرنے کی کوششیں مثلاً لاہور کے عوامی میلوں، رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماعات اور یوم اقبال کی تقریبات میں اخباری اشتہاروں، پوسٹروں اور ہینڈبلوں کے علاوہ دس دس ہزار کی تعداد میں 'دعوت الی اللہ' اور 'راہ نجات' ایسے کتابچوں کی تقسیم۔ اور آخری مگر کمترین نہیں، قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز جس پر ان سطور کی تحریر کے وقت تک کم و بیش پانچ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے! ــــــ اور ان سب کا حاصل یہ کہ 'درس قرآن' کا چرچا تو بحمد اللہ دُور دُور تک ہے ہی کم از کم پاکستان کے طول و عرض میں راقم کا نام 'دعوت رجوع الی القرآن' کی علامت بن گیا ہے! ذالك فضل الله يوتيه من يشاء۔

ع این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

---

[1] جس میں امام فراہی اور مولانا اصلاحی کی گرانقدر تصانیف کے علاوہ شامل ہیں راقم کے مختصر کتابچے بھی، جن میں سے ایک 'یعنی اسلام کی نشاۃ ثانیہ' کا ذکر تو اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن دوسرے یعنی 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' کا ذکر نہیں ہو پایا۔ حالانکہ اس کے ذکر کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ بحمد اللہ اس کے پانچ ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں بلکہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم نے حد درجہ عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ اور عربی میں کیا مولانا صہیب حسن المسلفی نے یہ کہہ کر کہ "اس کو پڑھنے سے خود مجھ پر جو اثر ہوا اس سے میں نے سوچا کہ اگر کسی کتابچے سے ایک 'مولوی' بھی متاثر ہو سکتا ہے تو عوام کے حق میں تو وہ لازماً تریاق ہوگا"

مزید برآں ـــــ اور نافلۃً لک کے درجے میں یہ کہ "تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ فرمانِ نبوی "اِنّی اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" میں بیان شدہ مقاصد کے پیش نظر سفر کا آغاز کر چکا ہے اور اس راہ کے پہلے اقدام یعنی تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کی دعوت زبانوں پر آنے اور کانوں سے ٹکرانے لگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قافلہ بھی بہت ہی چھوٹا ہے اور اس کا قائد بھی حد درجہ حقیر پُر تقصیر۔ لیکن یہ اطمینان پوری طرح حاصل ہے کہ کرنے کا کام ہے یہی!

اُئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کیلئے عیش دوام ہے یہی!

راقم کو جو ساتھی ملے ہیں وہ راقم کے لئے اللہ کا عطیہ ہیں۔ اور راقم تو قائل ہی اس کا ہے کہ ع "ہر چہ ساقیٔ ماریخت عین الطاف است!" کبھی ان سے کسی کی سست رفتاری یا سہل انگاری سامنے آتی ہے تو راقم اپنے آپ سے کہتا ہے کہ

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!

اور اس عاجز پر اللہ کا یہ بڑا فضل ہے کہ جب کسی ساتھی سے کسی کمزوری کا ظہور ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ لامحالہ اس کی اپنی ہی کسی کمزوری کا مظہر ہے!۔

اور سب سے بڑھ کر اطمینان بخش بات یہ ہے کہ اس دعوت کا آغاز نہ کسی مصنف کی تصانیف سے ہوا نہ کسی خطیب کے خطبات و تقاریر سے بلکہ بحمد اللہ درس قرآن، سے ہوا۔ اور اب بھی اس کا دار و مدار اور مرکز و محور ہے اللہ کی کتاب! ـــــ اور اللہ کی کتاب کی ترجمانی اور افہام و تفہیم میں بھی، بفضلہٖ تعالیٰ وعونہٖ، کسی ایک لکیر کی فقیری نہیں بلکہ ابوالکلام اور ابوالاعلیٰ کی دعوت جہاد کا عنصر بھی شامل ہے اور فراہیؒ اور اصلاحی کے تفکر و تدبر[۱] کا جوہر بھی، اور شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ کے احوالِ باطنی و نکاتِ روحانی کی چاشنی بھی

[۱] یہ بات اب تو یقیناً مولانا اصلاحی اور ان کے بعض شاگردوں کو بہت ناگوار ہو گی۔ لیکن غالباً مولانا بھولے نہ ہوں گے جناب وحید الدین خاں صاحب کی شہادت جو انہوں نے راقم کے بعض دروس میں شمولیت کے بعد مولانا کے سامنے دی تھی کہ "راقم کے درس میں فکر فراہیؒ کے اثرات سموئے ہوئے ہیں" اور اگر یہ یاد نہ ہو تو

موجود ہے اور ڈاکٹر اقبال کے جذبہ ملّی کی حرارت اور ان کی اور ڈاکٹر رفیع الدین کی علوم جدیدہ اور فکر جدید پر قرآن حکیم کی روشنی میں جرح و تنقید کی کڑوی کوشش بھی! ——— یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے تو یہ کہا کہ "آپ کے درس کے بارے میں یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ اس سے ہر شخص کچھ نہ کچھ ضرور لے کر اٹھتا ہے" ملے اور احباب کا کہنا یہ ہے کہ اس میں حد درجہ 'جامعیت' ہوتی ہے ——— اگر اُن کا خیال کسی بھی درجے میں صحیح ہے اور جامعیت سے کوئی حصّہ راقم کو فی الواقع ملا ہے تو یہ سرسرا فیض ہے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے اُنس، قلبی مناسبت ذہنی اور کسی درجے میں نسبتِ رُوحانی کا۔ اور اگر ان کا خیال مطابقِ واقعہ نہیں تب بھی راقم ربّ العزت سے خواستگار ہے کہ وہ اسے اُس جامعیتِ کبرٰی میں سے قدرِ قلیل ہی سہی مگر کچھ نہ کچھ حصہ ضرور عطا فرما دے جس کا مظہرِ اتم تھے بارھویں صدی ہجری میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور چودھویں صدی ہجری میں شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ ——— گویا بقول اقبال ؔ ـــ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

بھی مولانا کے اپنے وہ الفاظ تو مطبوعہ موجود ہیں جو انہوں نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" پر تقریظ میں تحریر فرمائے تھے کہ ——— "اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز اُمیدیں ان سے وابستہ ہیں،، عجب اتفاق ہے کہ اسی کے لگ بھگ الفاظ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی وفات پر تعزیتی مضمون میں ان کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی کے بارے میں لکھے تھے کہ "۔۔۔ جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن اصلاحی ہیں۔ ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔"

ملے یہ الفاظ ہیں مولانا اصلاحی کے شاگردِ رشید جناب خالد مسعود صاحب کے برادر نسبتی ڈاکٹر انوار احمد بگوی کے جو راقم کے کرم فرماؤں، اور شدید ناقدوں میں سے ہیں۔

"میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو — میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہر شاہوار کر!"

اور ظاہر ہے کہ اللہ کی شانِ کریمی سے یہ بعید بھی نہیں -

ع۔ "وہ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!"

اُمت مسلمہ کی زبوں حالی کا اصل سبب اور

اس کے جملہ امراض کا واحد علاج

حکیم مشرق علامہ اقبال مرحوم

کے اشعار کی روشنی میں

خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی — شکوہ سنج گردشِ دَوراں شُدی

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ

○

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

مثلِ حق پنہاں وہم پیدا ست او — زندہ و پائندہ و گویا ست او

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شود

ایک نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور تاریخ ہند کے اس دور میں ہوا جب ہندوستان میں بسنے والی اُمّتِ مسلمہ کا دینی و اخلاقی زوال بھی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور برِّ صغیر میں مسلمانوں کے چھ صد سالہ اقتدار کا قصر بھی بوسیدہ اور مضمحل ہو چکا تھا اور یہ عظیم الشان اور فلک بوس عمارت منہدم ہوا چاہتی تھی!

چنانچہ ایک طرف سلطنتِ مُغلیہ کے زوال اور حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد سیاسی طور پر طوائف الملوکی کا دَور دَورہ تھا اور اُمراء و سلاطین کی عظیم اکثریت فسق و فجور اور لہو و لعب میں بدمست ہونے کے علاوہ باہمی افتراق و انتشار اور جنگ و جدال کا شکار بھی تھی، دوسری طرف علماء کی اکثریت نہ صرف یہ کہ دُنیا پرستی کی لعنت میں مبتلا تھی بلکہ انہوں نے دین و مذہب کو جذبہ و رُوح سے عاری و تہی محض ایک خشک قانونی و فقہی نظام کی حیثیت دے دی تھی۔ تیسری طرف صوفیا کے طبقے میں شریعتِ اسلامی سے آزادی ہی نہیں بیزاری کا رُجحان غالب تھا اور انہوں نے ہندی و یُونانی نظریات کی آمیزش سے تصوّفِ اسلامی کے چشمۂ صافی کو گدلا کر دیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ان حالات میں عوام الناس کا تو کہنا ہی کیا، وہ بقول حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے ؎

"وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ وَاَحْبَارُ سَوْءٍ وَ رُھْبَانُھَا"

اور بقولِ شاعرِ مشرق "لے کُشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری" ان تینوں طبقات کی بُرائیوں کے جامع بن گئے تھے۔

اُمّت کا یہ زوال و اضمحلال فطری طور پر اغیار و اعداء کے مذموم ارادوں کی تقویت

کا موجب بن رہا تھا۔ چنانچہ پایۂ تخت کے قرب و جوار میں روز افزوں جاٹوں کی یورش کے علاوہ برِّ صغیر میں بیک وقت تین فتنے تین مختلف سمتوں سے قلبِ مملکت کی جانب یلغار کے لیے پر تول رہے تھے۔ یعنی ایک مشرق سے انگریزی استعمار کا عفریت جس نے ابتداءً تو تجارت کا لبادہ اوڑھا تھا لیکن ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی کے بعد سے ایک عسکری قوت کی حیثیت سے کم از کم بنگال میں قدم جما لیے تھے۔ دوسرا شمال سے یعنی سکھوں کی یورش جس نے ابتداءً مذہبی اصلاح کے پردے میں قدم جمائے تھے لیکن اب دفعۃً عسکری صورت اختیار کر لی تھی اور تیسرے جنوب سے مرہٹوں کی یورش کا عظیم فتنہ جو ابتدا ہی سے بالکل عریاں تھا اور جس کی قیادت ابتدا ہی سے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی[1] اور جو مسلمانوں سے چھ صد سالہ غلامی کا بدلہ لینے کے عزائم بد کے ساتھ دوسرے دونوں فتنوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی و تندی کے ساتھ تاخت و تاراج کرتا ہوا قلبِ مملکت تک پہنچ چکا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن میں ۱۷۰۳ء میں دہلی کے ایک روشن ضمیر اور "خود آگاہ و خدامست" انسان شاہ عبدالرحیم کے گھر میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے آنکھ کھولی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، سات سال کی عمر میں حفظِ قرآن سے فارغ ہو گئے اور پندرہ سال کی عمر میں جملہ علومِ عقلیہ و نقلیہ سے فراغت حاصل کر لی۔ بعد ازاں حج بیت اللہ اور زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے اور وہاں کے علمی و روحانی سلسلوں سے بھی فیض حاصل کیا اور تیس سال سے بھی کم عمر میں اپنے عظیم الشان اصلاحی و تجدیدی کام کا آغاز کر دیا۔

---

[1] واضح رہے کہ سیواجی کا تعلق بھی اودے پور کے راناخاندان سے بتایا جاتا ہے اور اس کے بعد تو مرہٹہ تحریک کی قیادت براہِ راست کوکنی پنڈتوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔ اس میں ایک گہری مماثلت ہے۔ انڈین نیشنل کانگرس کی تحریک سے جس کی قیادت میں اوّلاً جنوبی ہند کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا پلڑا بھاری رہا۔

مُجدّدِ دینِ اسلام کی فہرست میں امامُ الہند کا نام نامی بلاشبہ بہت بُلند مقام پر ہے اور یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ دَورِ جدید کے فاتح اور ملّتِ اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ کے نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب کی تجدیدی مساعی میں اوّلین اہمیّت علمی و فکری اصلاح اور طریقِ تعلیم و تعلّم کی تطہیر اور تنظیم نَو کو حاصل ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلام ابتدا ہی سے ایک خالص قانونی و فقہی نظام کی حیثیّت سے آیا اور اُس کا تعلّق اپنے اصل سرچشمول یعنی قرآن اور حدیث سے محض بالواسطہ رہا۔ نتیجۃً حکمتِ دین کا ظہور کماحقّہٗ نہ ہو سکا لہٰذا شاہ صاحب نے اوّلین کوشش یہی کی کہ مسلمانوں کا تعلّق علم و حکمتِ دینی کے اُن اصل خزانوں سے بلاواسطہ قائم ہو جائے۔

چنانچہ ایک طرف انہوں نے بہ نفسِ نفیس قرآنِ حکیم کا ایک نہایت عمدہ ترجمہ سلیس فارسی میں کیا اور ان کے جلیل القدر صاحبزادگان میں سے دو نے قرآن مجید کے اُردو ترجمے کئے یعنی شاہ رفیع الدّین صاحب نے لفظی اور شاہ عبد القادر صاحب نے بامحاورہ اور کون نہیں جانتا کہ قرآن مجید کے تمام اُردو تراجم کا سلسلۂ نسب بالآخر انہی دو ترجموں سے جا ملتا ہے دوسری طرف شاہ صاحب نے ایک مختصر لیکن نہایت وقیع رسالہ "اَلْفَوْزُ الْکَبِیْرُ فِیْ اُصُوْلِ التَّفْسِیْرِ" کے نام سے رقم فرمایا جس نے فہمِ قرآن کی راہیں کھولیں اور قرآنِ حکیم پر غور و فکر کے صحیح طریق کی نشاندہی کی۔

مزید برآں شاہ صاحب نے حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی تعلیم و تدریس پر زور دیا اور خود نہ صرف یہ کہ مؤطا امام مالکؒ کی دو شرحیں قلم بند کیں، یعنی ایک مُسَوّٰی بزبانِ عَرَبی اور دوسری مُصَفّٰی بزبانِ فارسی بلکہ ایک عظیم تصنیف یعنی "حُجَّۃُ اللّٰہِ الْبَالِغَہ" کے ذریعے احادیثِ نبوی کی ایک بڑی تعداد کی علمی قدر و قیمت کو اجاگر کیا اور اس حکمتِ تشریع کی نشاندہی کی جو شریعتِ اسلامی کی پشت پر کار فرما ہے۔

شاہ صاحب کی یہ عظیم تصنیف ان کے اجتماعیاتِ انسانی کے مسائلِ دقیقہ کے گہرے

فہم پر دلالت کرتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اُسے جدید عمرانیات کے لیے "اُمّ الکتاب" قرار دیا جاسکتا ہے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب آج سے دو اڑھائی سال قبل ان مشکل مسائل اور پیچیدہ معاملات کا کتنا صحیح فہم و شعور رکھتے تھے جو تمدّن و عمرانیات کے میدان میں آج کے انسان کو درپیش ہیں۔

تاریخ اسلامی کے صدرِ اوّل اور نظامِ خلافت کے متعلق جو غلط فہمیاں عام ہوگئی تھیں اُن کے ازالے کے لیے شاہ صاحب نے "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" — اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ایسی عظیم الشان کُتب تصنیف فرمائیں۔

ان سب پر مستزاد ہیں ان کی وہ دقیق تصانیف جو فلسفہ، حکمت اور تصوّف کے غوامض سے بحث کرتی ہیں اور جن کا فہم عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں غلط فہمیاں عام ہیں۔

اس علمی اصلاح و تجدید کے ساتھ ساتھ جسے عالمِ اسلام میں یورپ کی "تحریکِ اِحیاءُ العلوم" (RENAISSANCE) کے بالکل ہم پلّہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب ایک روشن ضمیر اور بیدار مغز انسان کی طرح اردگرد کے حالات کا جائزہ بھی لیتے رہے اور متذکرہ بالا فتنوں کا صحیح صحیح اندازہ کرتے ہوئے اُن کی روک تھام کے لیے تدابیر پر غور فرماتے رہے۔ سکھوں کا فتنہ اپنی تمام تر دحشت و بربریّت کے باوصف ابھی صرف پنجاب تک محدود تھا۔ تاہم بعد میں شاہ صاحب کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اسی خانوادۂ علمی و رُوحانی کے ایک فیض یافتہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ بریلوی کی معیّت میں جو پنجہ آزمائی اس فتنے سے کی اُسے بہرحال شاہ صاحب ہی کے فیض کا تسلسل قرار دیا جائے گا۔ انگریزی استعمار کا فتنہ بھی ابھی قلبِ مملکت سے قدرے دُور تھا۔ تاہم اس فتنے سے بھی بعد میں علمائے دیوبند خصوصاً مولانا محمود الحسنؒ اور اُن کے رفقا و تلامذہ مثلاً مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ جس طرح نبرد آزما رہے یہ بھی حقیقتاً سلسلۂ ولی اللٰہی ہی کی ایک کڑی ہے۔ البتہ مرہٹہ یورش کی تاخت و تاراج پایۂ تخت تک پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا شاہ صاحب نے اوّلین اہمیّت اسی کو دی اور یہ در اصل انہی کی دعوت

شاہ ولی اللہ دہلوی رح کی

قرآنی خدمات

(ماخوذ از "رودِ کوثر" تالیف شیخ محمد اکرام بشکریہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ)

آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندرنامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے۔ پرانے علماء اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ۔ یعنی مفہوم

یہ ہوا کہ احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان کا قصد کیا اور ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری اور عظیم ترین جنگ میں مرہٹوں کو شکستِ فاش دی اور اس فتنے کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

علامہ اقبال مرحوم نے حضرت مجدد الفِ ثانی کے بارے میں فرمایا کہ ؎

"وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان — اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!"

یہ بات جتنی صحیح حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کے بارے میں ہے اتنی ہی صحیح امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے بیے بھی ہے۔

معرکۂ پانی پت کے دو سال کے اندر اندر بارھویں صدی ہجری کا یہ مجددِ دینِ حق بحساب قمری کُل ساڑھے اکسٹھ سال کی عمر میں واصل بحق ہوگیا رحمہ اللہ تعالیٰ وادخلہ فی اعلیٰ علیّین! وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

و معانی سمجھنے اور اُس کی رُوح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان عُلما اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلامِ مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلامِ مجید کے بعض حصّوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتہ چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا انھیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پُوری طرح واقفیّت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلامِ مجید کے کسی بیان پر اعتراض کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلامِ مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بُوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۳۸-۱۷۳۷ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلامِ مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علما کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ کلامِ مجید کی انتہائی بے اَدَبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔

انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا

نہ اسے ریشمی جُزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرّکاً رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس

لہ شیخ سعدیؒ کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے، لیکن شیخ سعدیؒ سے اس کی نسبت مُشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہُوا۔ شاہ صاحب سے پہلے ملک العلما قاضی شہاب الدّین دولت آبادی نے سلاطینِ جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحرِ مواج لکھی تھی جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جُزوی تھی اور اُسے کبھی بھی عام مقبولیّت نصیب نہیں ہوئی۔

کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اُردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہوگئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کارِ خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دشواریاں دُور کر دیتے جو عام عُلماء کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطورِ خود بلند پایہ اور قابلِ قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور اُمورِ مذہب میں مغز کو چھوڑ کر اُستخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دِقتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اُس کی اَدبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج، جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین عُلما و اُدبا نے اس قومی خدمت پر توجہ کی ہے۔ ایک بھی ترجمہ ایسا نہیں، جسے تسلّی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زور بیان، فصاحت و بلاغت اور رُوحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بُلند پایہ ترجمے کے لیے علما اور اہلِ قلم کی ایک پُوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے، وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا نذیر احمد کہتے ہیں۔ "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہؒ میں علیٰ وجہِ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحبؒ کی نظر تفاسیر اور احادیث

اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصّہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسّرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیشِ نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اُسے اختیار کرتے ہیں۔"

شاہ صاحبؒ نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدّمہ فی ترجمۃ القرآن مجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لیے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ عظیم الشّان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین اُمّت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کرکے ہی نہیں کی، بلکہ علمِ تفسیر کے متعلّق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں الفوز الکبیر فی اُصُول التفسیر خاص طور پر قابلِ فکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں عُلُومِ قرآنی اور مطالعۂ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلۂ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالی ہے اور وہ آیاتِ منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سَو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علّامہ جلال الدّین سُیوطیؒ نے بھی بیس۲۰ مقرّر کی تھی چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

فوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلّق اسبابِ نُزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلامِ مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اوّل میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"عام مفسّرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی، ایک قصّے کے

ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصّے کو اس آیت کے لیے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نزولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریہ کی تہذیب اور اُن کے باطل عقاید اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اِس لیے آیاتِ مناظرہ کے نزول کے لیے متکلمین میں عقاید باطلہ کا وجود اور آیاتِ احکام کے لیے ان میں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیاتِ تذکیر کے نزول کے لیے ان کا بغیر ذکرِ آلاء اللہ و ایّام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہُوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے اسبابِ نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہُوا ہو"

فوزالکبیر کی دوسری خصوصیّت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانۂ جاہلیّت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی" انصاف بالائے طاعت" کے اُصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتاب کو بدل ڈالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہؒ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں" یہودی تحریفِ لفظی، تورات کے ترجمے وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہُوا ہے اور ابنِ عباسؓ کا بھی یہی قول ہے"

بعض مفسّرین نے اہلِ کتاب سے قصّے لے کر انھیں قرآنی تفاسیر اور عُلُومِ اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جا بجا آواز بلند کی ہے مثلاً فوز الکبیر میں لکھا ہے" یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاءِ سابقین کے قصّے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسّرین بیان کرتے ہیں وہ سب اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہُ علماءِ اہلِ کتاب سے منقول ہیں" اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں" اسرائیلی روایات کا نقل کرنا

ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ صحیح اُصول یہ ہے کہ اُن کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔" مفسّرین کے بعض قصّے جنھیں عوام اسلام کا ضروری جُزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے "اور محمّد بن اسحٰق واقدی کلبی نے قصّہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصّہ لائے ہیں) محدّثین کے نزدیک اُن کا اکثر حصّہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علمِ تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی اور اس کے حفظ پر فہمِ کتابُ اللہ کو موقوف کرنا دراصل کتابُ اللہ سے اپنا حصّہ کھونا ہے۔"

مفسّرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیّت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر، اور وہ بھی تفسیرِ جلالین (بقدرِ درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں "قرآنِ عظیم اس طرح پڑھاویں کہ صرف قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھا جائے مگر جہاں شانِ نزُول یا قاعدۂ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں بعد اس کے تفسیرِ جلالین بقدرِ درس پڑھاویں۔" (ترجمہ)

بقیہ "عرضِ احوال"، صفحہ ۳ سے آگے

مفید سے مفید تر بنانے کے لیے ہر مشورے کا خیر مقدم کیا جائے گا اور ان شاء اللہ ہر مفید مشورے اور تجویز کو اپنانے کی پُوری سعی کی جائے گی ——— اس کے ساتھ ہی منتخب نصاب کے دروس اور ڈاکٹر صاحب کے خطابات کی ایک تدریج سے اشاعت کا پروگرام بھی پیشِ نظر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو نظرِ ثانی کا موقع اگر مل سکا تو نورٌ علیٰ نُور لیکن نظرِ ثانی کے انتظار میں کام تعویق میں نہیں رہے گا، ان شاء اللہ ——— تنظیمِ اسلامی کے استحکام اور دعوت کی توسیع نیز مرکزی انجمن کے دفتر سے متعلق روزمرّہ کے کاموں کی

بروقت تکمیل کی طرف بھی پوری توجہ دینے کی کوشش کی جائے گی۔ بحمد اللہ ایسے باصلاحیت اور فعّال رفقاء کی کمی نہیں ہے جنھوں نے معاش کے بعد اپنے فرصت کے لمحات اس دعوت کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں اور ایک بڑا قیمتی سرمایہ مخلص رفقاء کی شکل میں موجود ہے۔ بس سرمایہ کو صحیح نہج پر لگانے (INVEST) کی طرف ان شاء اللہ خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔ اگر اس عاجز کو اپنی پشت پر ان مخلص رفقاء کی معاونت نظر نہ آتی تو شاید اس بارِ گراں کو اٹھانے میں خاکسار کو تأمّل ہوتا

قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا سلسلہ بفضلہٖ تعالیٰ جاری ہے۔ آٹھ اسٹاف کوارٹرز کی تعمیر تکمیل کے مراحل میں ہے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر صاحب عید الاضحیٰ کے بعد وہاں منتقل ہو جائیں گے۔ قرآن ہال کی تعمیر کا پہلا مرحلہ یعنی زیرِ زمین لیکچر رُوم اور دفتر و مکتبہ کے کمروں کی تکمیل اواخر جنوری ۱۹۷۷ء تک متوقّع ہے۔ جس کے بعد ہال کی تعمیر اور ہوسٹل و دیگر متعلقہ عمارات کے مراحل درپیش ہوں گے۔ انجمن کا تقریباً تمام فنڈ موجودہ تعمیر میں لگ چکا ہے۔ مزید فنڈز کی شدید ضرورت ہے۔ جس کے لیے ہم اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت کے خواستگار ہیں ہی کے فضل و کرم سے قرآن اکیڈمی کی تعمیر کے اب تک کے مراحل طے ہوئے ہیں اور آئندہ مراحل بھی اُسی کے فضل و کرم سے طے ہوں گے۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ الْعَزِیْز!

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ ہُوا، ہُوا کرم سے تیرے جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا!

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض ہے کہ دعوت رُجوع اِلی القرآن کے محسوس فوائد ایک تو اس صورت میں نظر آرہے ہیں کہ ملک کے قدیم و جدید عُلوم سے بہرہ مند مخلص و فہیم لوگوں کا التفات قرآن حکیم کے درس و تدریس، تعلیم و تعلّم نیز اس کتابِ مُبین کے فلسفہ و حکمت کی تفہیم اور اس پر تفکّر و تدبّر کی طرف منعطف ہو رہا ہے۔ لوگ اس تشخیص پر مطمئن ہو رہے ہیں کہ ہمارے زوال و انحطاط کا سب سے بڑا سبب قرآن حکیم کو چھوڑ دینا ہی ہے اور کوئی اصلاح، تبدیلی اور انقلاب (چاہے وہ انفرادی دائرہ سے متعلّق ہو چاہے اجتماعی دائرہ سے) اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کتابِ الٰہی کے ساتھ ہمارا صحیح تعلّق اُستوار نہ ہو ـــــ دوسرے اس صورت میں کہ اس دعوتِ قرآنی کی برکت سے، اِس سے متأثّر ہونے والے حضرات میں فقہی مسالک کے اختلافات (جن کو بدنصیبی سے اصل دین سمجھ لیا گیا ہے) پس منظر میں چلے

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

کا ایک سبق آموز واقعہ

بروایت مولانا مفتی محمد شفیعؒ

ماخوذ از "وحدت اُمّت" ـــــ تالیف مولانا مفتی محمد شفیعؒ

شائع کردہ ـــ مکتبہ المنبر ـــ لائل پور

"شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ مالٹہ کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے جب اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے لئے امت کی صلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جو انکی زبان مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقصد کا پتہ دیتا ہے فرمایا "الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے" جیل کی تنہائیوں میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقا نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا "اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول

جاتے ہیں اور ملک کے ہر دو مشہور مسالک (حنفی اور اہلِ حدیث) سے تعلق رکھنے والے حضرات اس دعوتِ قرآنی پر شرحِ صدر کے ساتھ لبّیک کہہ رہے ہیں اور اس کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے ہیں اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا کے حکمِ ربّانی پر عمل ہو رہا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝

ہے یا نہیں"

مالٹہ کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے، علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ "ہم نے تو مالٹہ کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں" یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علما کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔

نباضِ اُمت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لئے سعی پیہم فرمائے بذاتِ خود درس قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علما بھی شریک ہوتے تھے، عوام بھی، اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر اس واقعے کے بعد حضرتؒ کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔

"آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث وآفات سے دوچار ہیں اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے۔ قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ـــــ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔

ملت کے ایک اور عظیم فرزند

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

کی رائے جو اس دور میں ظاہر ہوئی جب وہ جمیع اسلامیانِ ہند کی آنکھ کا تارا تھے اور انہوں نے ابھی انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار نہ کی تھی:

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو۔ تو اس کو بتایا جاسکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ کاملین کا فقدان اور علماءِ سوء و مفسدین دجالین کی کثرت ـــــ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالکؒ[1] کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیئے کہ "لا یصلح اٰخر ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہوسکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں"

مولانا ابوالکلام آزاد

ماخوذ از 'البلاغ' جلد اول، شمارہ اوّل مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء

---

[1] یہ قول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہے جسے نقل فرمایا امام مالکؒ نے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حافظ احمد یار صاحب
استاذ شعبۂ معارفِ اسلامیہ، جامعہ پنجاب

عظمتِ قرآن

ایک اور پہلو

(یہ مقالہ تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں پیش کیا گیا)

الحمد للہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ
امّا بعد! فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم ط

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (القصص: ۴۹-۵۰)

محترم صاحبِ صدر و معزز خواتین و حضرات!

آج کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں کی غالب اکثریت اُصُولاً اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ اس کارخانۂ حیات کا ایک بنانے والا ہے جو خود ہی اس کا چلانے والا ہے۔ (کسی کو ٹھیکہ پر نہیں دے رکھا) ——— اور یہ کہ اس خالق و مالک نے کائنات کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ شے بھی بے کار اور بے مقصد نہیں بنائی ——— انسان نے کائنات کی بے شمار چیزوں کے مقصدِ تخلیق پر توجّہ دے کر اپنے عُلُوم کو تو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، لیکن عجیب بات ہے کہ خود اپنے مقصدِ تخلیق کے بارے میں وہ تغافل اور تجاہل پر ہی گذارہ کرتا رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے زندہ رہنے کے لیے اس

کائنات کی ضرورت ہے، لیکن خود کائنات کی زندگی کے لیے انسان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لیے عقل انسانی کو اس بات پر آمادہ کرنا بڑا مشکل کام ہے کہ وہ یہ مان لے کہ انسان کی زندگی اور اس کی حیرت انگیز صلاحیتیں بالکل بے مقصد ہیں ـــــ وہ زندگی اور وہ صلاحیتیں جن کی بقاء اور نشو و نما پوری کائنات کا مقصدِ تخلیق معلوم ہوتا ہے۔

عقل و دانش اور ارادہ و اختیار سے بہرہ ور ہونے کی بنا پر، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر مختلف عوامل کے زیر اثر، ہر انسان اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کر لیتا ہے۔ مقصد کا یہی تعین اس کے جملہ اعمال کی صورت گری کا باعث بنتا ہے انفرادی اور اجتماعی سطح پر متضاد مقاصد کے باہمی تصادم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانی ناکامیوں، مایوسیوں، تباہیوں اور خونریزیوں کے مسلسل تاریخی عمل نے ثابت کر دیا ہے کہ انسانیت کی فلاح و بہبود بلکہ بقاء کے لیے ضروری ہے کہ مشترک انسانی اقدار کی بنا پر پوری انسانی زندگی کا کوئی عالمگیر مقصد اور نصب العین متعین ہونا چاہیئے۔ اختلاف "کیوں" میں نہیں صرف "کیا؟" میں ہے۔

مجمع بازوں کے بے پناہ شور و غل اور خریداروں کی تمیز سود و زیاں کو شل کر دینے کی ساری فسوں سازیوں کے باوجود بازارِ حیات میں انسانوں کی اکثریت ابھی اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ بلکہ شاید آگاہ تر ہو رہی ہے۔ کہ سعدیؒ کے الفاظ میں "خوردن" اور عوامی زبان میں "روٹی، کپڑا اور مکان" انسان کی حیوانی زندگی کی بقاء کے لیے ایک بنیادی ضرورت تو ہے مگر اسے اور صرف اسے ہی انسانی زندگی کی منزل مقصود یا اس کا بدل اور انسان کی ساری صلاحیتوں کا ماحصل ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حیوانات اپنی زندگی کی بقاء اور اس میں توازن کے لیے (جس میں افزائش نسل بھی شامل ہے)۔ بیرونی دنیا میں بعض طبعی قوانین اور اندرونی طور پر بعض حواس اور جبلتوں کے تابع سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہ حواس اور جبلتیں حیوانات کی زندگی کا مقصد "خوردن" تک محدود بھی کر دیتی ہیں اور اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ بھی بنتی ہیں۔

انسان کا معاملہ ذرا مختلف ہے، اسے حواس اور جبلّتوں کے علاوہ عقل بھی دی گئی ہے۔ عقل ایک ایسی صلاحیّت ہے جس کے ذریعے انسان بڑی حد تک اپنی حیوانی جبلّتوں پر قابو پا لیتا ہے اور اپنی ادنیٰ فطرت کو اُبھرنے یا بے لگام ہونے سے روک بھی سکتا ہے۔ دوسری طرف یہی "عقل" انسان کی حسّی ضروریات اور اس کی جبلّی خواہشات کی تسکین کے لیے ذرائع و اسباب کی تلاش کو ـــــ کبھی مکر و تدبیر کے ذریعے اور کبھی قوائے فطرت کی تسخیر کے ذریعے ـــــ سہل اور آسان کر دیتی ہے۔ یوں "عقل" انسان کے لیے حیوانات کے مقابلے پر مسئلۂ "خوردن" کا بہتر اور تیز تر حل مہیّا کرتی ہے تاکہ وہ مقصدِ زیستن کی طرف متوجّہ ہو سکے ـــــ مگر غالباً اس وجہ سے کہ عقل کا دائرۂ کار بہرحال حسّی اور جبلّی زندگی تک محدود ہے، عقلِ انسانی اکثر حواس اور جبلّتوں پر حکمرانی کرنے کے بجائے ان کے غلام کی حیثیّت سے کام کرنے لگتی ہے۔ عقل کی حیثیّت ایک سواری کی سی ہے جس کو کسی بھی منزل تک بآسانی پہنچنے کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ رہا خود منزل و نصب العین کا تعیّن، تو یہ تنہا عقل کے بس کی چیز نہیں ہے اس کے لیے خود اُسے کسی اور سرچشمۂ علم کی ضرورت ہے۔

جس ذاتِ برتر نے انسان کے اندر مختلف صلاحیّتیں ودیعت کیں، جس نے انسان کے حواس اور جبلّتوں کی اصلاح اور امداد کے لیے عقل عطا کی، اس نے عقل کی امداد اور اصلاح کے لیے، انبیاءِ کرام علیہم السّلام کے پاک نفوس کے ذریعے خارجی ہدایتِ وحی سے بھی نوازا۔ یہ خارجی ہدایت انسانی عقل و بصیرت کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو بصارت کے لیے خارجی روشنی۔

اس ہدایت یعنی انبیاء علیہم السّلام کی تعلیمات سے مسلّح ہونے کے بعد انسان جبلّتوں، حواس اور عقل کے حلقہ در حلقہ جال سے باہر نکل آنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ان آسمانی صداقتوں کی روشنی میں انسان اپنی تقدیر کا تصوّر اور اپنی منزل کا تعیّن کر سکتا ہے ـــــ وحیٔ الٰہی یا پیغمبرانہ شعور انسان کو ان حدود سے آگاہ کرتا ہے جن کے اندر رہنا انسان کی سلامتی و بقاء اور اس کی ذات میں مضمر صلاحیّتوں کی صحیح نشوو

نما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس ہدایت کے قبول کر لینے ہی کو اسلامی اصطلاح میں ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب کہا جاتا ہے۔ رسول اور کتاب دونوں اسی ایک خدا کی طرف سے ایک ہی حکمتِ ربانی کے دو اجزاء اور ایک ہی مقصدِ دعوت کی تکمیل کے دو ذرائع ہوتے ہیں۔

انسانوں کی رُشد و ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں انبیاء مبعوث فرمائے۔ ہر نبی کی تعلیمات اس ربانی علم و حکمت کا ایک جزء ہوتی تھیں جو اس کے سینے میں ہوتا تھا۔ اس تعلیم کا لفظی بیان بعض دفعہ کتاب یا صحیفہ کی صورت میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے دیا جاتا تھا، جب کہ اس تعلیم کا عملی نمونہ اور مظہر خود رسول کی زندگی ہوتی تھی۔

قرآنِ کریم نسلِ انسانی کی رہنمائی کے لیے ربانی پیغامات اور وحیٔ الٰہی کے بذریعہ کتاب و رسولؐ نزول کے ایک طویل عمل کا مُصدِّق بھی ہے اور مُکمِّل بھی۔ ابتداءً مختلف خطّوں اور مختلف حالات میں بٹی ہوئی مختلف قوموں کو تاریخ کے خاص خاص ادوار میں خاص خاص ربانی پیغام پہنچانے ہی ضروری تھے۔ انسان کی ہمہ گیر ترقی کی رفتار اس قسم کی قسط وار تعلیم اور اس پر عمل کے وقفوں کے ذریعے ہی آگے بڑھائی جا سکتی تھی۔ اسلام کے ساتھ اس سلسلۂ احکامِ ربانی یعنی دین کی تکمیل ہو گئی۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری پیغمبر ——— اور قرآنِ کریم انسانوں کے لیے اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے۔ اور دونوں تمام مخلوق کے لیے عموماً اور انسانوں کے لیے خصوصاً اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہرِ اتم ہیں " اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ " اور " وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ " کے ذریعے اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے ——— نوعِ انسانی کی طرف آخری نبی... (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آخری کتاب آجانے کے بعد الہامی پیغاموں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب اس آخری اور جامع و مکمل الہامی پیغام پر عمل کر کے ——— یا اس کو رد کر کے ——— اس کے نتائج دیکھنے کا زمانہ شروع ہو گیا۔

نزولِ قرآن کا دور انسانی تاریخ میں انسانی فرد کے زمانۂ بلوغ سے مشابہت

رکھتا ہے۔ قرآنِ کریم بالغ "انسانوں" نہیں ـــــ بلکہ بالغ "انسانیت" ـــــ یعنی عصرِ حاضر کو درپیش مسائل کے حل میں عقلِ انسانی کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے اپنے آپ کو ہدایت، علم، بصائر، شفاء، نور اور بیّنات وغیرہ کے اوصاف سے رُوشناس کراتا ہے۔ یعنی قرآن ہدایت دیتا ہے علم اور حکمت کے ساتھ ـــــ بصیرت دیتا ہے دلیل و برہان کے ساتھ ـــــ امراضِ قلبی کے لیے شفاء ہے بذریعہ موعظہ ـــــ وہ نور ہے جو جہالت و نادانی کی تاریکیوں سے نکالتا ہے ـــــ وہ ذکر للعالمین ہے جو ہر قسم کی فطرت کو اس کے کمالات یاد دلاتا ہے۔ وہ مومن و کافر، غنی و فقیر، متکبر و متواضع ہر ایک قسم کے انسان کی دل کی بات کی خبر دیتا ہے ـــ ہر ایک فردِ بشر اس کے کسی ایک عنوان کے تحت اپنا ذکر موجود پاتا ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام انسانی مسائل کا حل پیش کرنے میں قولِ فصل ہے۔

آج کے انسان کو ایسے پریشان کُن مسائل نے گھیر رکھا ہے کہ اگر کہیں سے یہ آواز آتی ہے کہ فلاں نظام، فلسفہ، دین، پارٹی یا شخص ہی اس کے تمام مسائل یا کم از کم اہم مسائل حل کر سکتا ہے تو یہ گھبرایا ہوا انسان فوراً ادھر متوجہ ہوتا ہے "تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے" ـــــ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا جملہ مدحیہ بن گیا ہے۔

کیا عظمتِ قرآن کے متعلق ہمارے اس قسم کے تعریفی بیانات اور مدحیہ کلمات محض جذباتی قصیدہ خوانی تو نہیں ہے؟ قرآنِ کریم کے متعلق اس قسم کے بلند بانگ دعووں پر ہم کوئی دلیل بھی پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ انسانی زندگی میں جذبات کی قدر و قیمت اور افادیت و ضرورت، عقلی دلیل و برہان سے کسی طرح کم قرار نہیں دی جا سکتی۔ کتنی دفعہ "خرد مندی" کی انتہا "صاحبِ جنون" ہونے کی دُعا پر منتج ہوتی ہے[1] عوام اور عوامیت کے اس دَور میں تو یوں بھی دلائل و براہین جذبات کے آستانۂ عالیہ پر صفِ نعلین میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ ہم ایک ایسے دَور میں رہ

---

[1] علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

خرد کی گتھیاں سُلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر!

رہے ہیں جہاں کم از کم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بلند بانگ دعووں، مسحور کن وعدوں اور دلکش نعروں کی صداقت کے بارے میں حقیقت کے جویا اور اپنی اس جستجو میں دلائل کے طلبگار نظر آتے ہیں۔

حضرات! بڑے دعووں، وعدوں اور نعروں کے ذکر سے آپ کا ذہن "گمراہ" نہ ہونے پائے۔ بڑے دعوے اور بڑے وعدے ہمیشہ ہی فریب باطل یا سراب نظر نہیں ہوتے، کبھی کبھی وہ سراسر حق و صداقت پر مبنی بھی ہوتے ہیں اور انسان میں اس نازک فرق کا ـــــ یعنی وعدۂ رحمٰن اور وعدۂ شیطان میں ـــــ امتیاز کرنے کی صلاحیت ودیعت کر دی گئی ہے۔ کسی بھی پیغمبر کا دعویٰ نبوّت و رسالت، غالباً انسان کے سامنے پیش کئے گئے دعووں میں سے سب سے بڑا اور بظاہر سب سے عجیب دعویٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دعویٰ کے صدق یا کذب کو پرکھنا ضروری بھی ہے اور مشکل بھی ـــــ اسی لیے انبیاءِ کرام (علیہم السّلام) کی صداقت کو اظہر من الشمس کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں مختلف قسم کے دلائل اور نشانات عطا فرمائے جن سے ان کے مخاطب کے اندر ودیعت شدہ تمام ذرائع ہدایت یعنی جبلّت، حواس اور عقل میں سے کسی ایک کو بھی تصدیق کے بغیر چارہ نہ رہے۔ بلکہ جُوں جُوں آخری نبوّت قریب آتی گئی، انسان کے لیے سب سے بڑے ذریعہ ہدایت یعنی وحیٔ الٰہی کے ذریعہ انبیاءِ کرام (علیہم السّلام) نے خود بھی اپنے ماننے والوں کو آنے والی نبوّت کو قبول کرنے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت خاتم النبیّن صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آمد پر آنحضورؐ کی صداقت کی پرکھ اور پہچان کے لیے ہر وہ ممکن اور معلوم انسانی ذریعۂ علم و ہدایت ـــــ اندرونی یا بیرونی ـــــ حسّی یا وجدانی ـــــ عقلی یا نقلی جمع کر دیا گیا، جو آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت کا قائل کرنے کے لیے دُنیا کے کسی ایک بھی انسان کو درکار تھا۔ آقائے دوجہاں کے دعووں کی صداقت

لہ آنحضرتؐ کے پاس ایک آدمی نے آکر کشتی لڑنے پر پچھاڑے جانے کو شرطِ صداقت قرار دے کر چیلنج کیا۔ حضور نے اسے ایک دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ پچھاڑ دیا (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

ـــــ تمام دعووں کی صداقت کو قبول کرنا یا نہ کرنا ہی اسلام اور کفر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت پر دنیا کی ہر قوم، مذہب بلکہ ہر فرد کے سامنے (صرف مخصوص معزز اور مدعو حاضرین کے سامنے نہیں[۱]) ان کے مناسب حال دلائل پیش کرنا مسلمانوں کے لیے فرض کفایہ ہے۔

علم و عقل کی فراوانی کے اس دور میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت پر علمی عقلی دلائل پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آنحضور کی صداقت پر ایک بہت بڑی زندہ علمی اور عقلی دلیل "عظمت و اعجازِ قرآن" ہے۔ عظمت و اعجاز قرآن کا بیان بھی ایک واجب شرعی اور فرضِ کفایہ ہے۔ اس لیے کہ "عظمت و اعجازِ قرآن" کے مختلف پہلوؤں کا بیان اور اس کی دلائل سے وضاحت دراصل اثباتِ رسالتِ محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہی ہے[۲]۔

قرآنِ کریم نے خود اپنی عظمت و اعجاز کو آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت کی دلیل کے طور پر اس تحدّی کی صورت میں پیش کیا ہے :-

(۱) وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا ـــــ وَلَنْ تَفْعَلُوْا ـــــ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ (البقرہ: ۲۳، ۲۴)

(۲) وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) وہ مسلمان ہوگیا۔ اسی طرح ایک اور آدمی نے آپؐ سے کہا "مجھے کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تم خدا کی قسم کھا کر کہہ دو کہ تم واقعی اللہ کے رسول ہو" حضورؐ نے قسم کھا کر کہا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ آدمی فوراً ایمان لے آیا۔

[۱] انہی دنوں عالمی سیرت کانگرس کا خاص شو ختم ہوا تھا۔

[۲] قرآن کانفرنس کی جس نشست میں یہ مضمون پڑھا گیا اس کا موضوعِ بحث "عظمت و اعجازِ قرآن" تھا۔

يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥ بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ٥ (یونس: ۳۷، ۳۹)

(۳) أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥

(ھود: ۱۳)

(۴) قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ٥

(الاسراء: ۸۸)

(۵) قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ٥ فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ٥

(القصص: ۴۹، ۵۰)

(۶) أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ٥ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ٥ (الطور: ۳۳، ۳۴)

اِن چھ آیات میں سے پانچ میں لفظ "مثل" استعمال ہوا ہے ماحصل سب آیات کا یہ ہے کہ قرآن کریم بے مثل و بے نظیر کتاب ہے اور انسان اُس کا جزوی مثل و نظیر پیش کرنے سے بھی ہمیشہ عاجز رہیں گے۔ قرآن کریم کا یہ چیلنج چودہ سو سال سے قائم ہے، دُنیا اسے قبول نہیں کر سکی ـــــ لیکن جس طرح مُسیلمہ کذّاب نے قرآن کے اُسلوب کو نقل کرنے کی کوشش کر کے اپنے پیروکاروں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی ـــــ اسی طرح آج مسلمان ـــــ بے خبر مسلمان ـــــ کی نظر سے

عظمتِ قرآن کو اوجھل رکھنے کے لیے بعض "ازم" قرآنی نظام کے مماثل بلکہ اس سے بہتر نظام کی حیثیت سے متعارف ہو کر اُبھر رہے ہیں۔ خود قرآن کریم کے ماننے والے ـــــ کم از کم ماننے والوں کے گھر پیدا ہونے والے ـــــ بعض سیاست گر اور دانشور بھی اس عُروس العرائس[1] کے سرخ گھونگھٹ پر ہی مرے جا رہے ہیں اس نظام کو قرآنی نظام کا مثل یا اس سے بہتر قرار دینے میں اسی کوتاہ فہمی یا دانستہ مغالطہ سے کام لیا جا رہا ہے، جس کی بنا پر ابراہیم علیہ السّلام کے حاکمِ وقت نے موت و حیات پر قادر ہونے میں اپنے آپ کو ربِّ ابراہیم کی "مانند" سمجھ لیا تھا۔ یا جس طرح بعض کُفّارِ مکّہ نے اپنی ساکھ رکھنے کے لیے "لَوْنَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ" (الانفال : ۳۱) کی صورت میں ایک کھوکھلا سیاسی بیان ہی جاری کر ڈالا تھا!!

قرآنِ کریم پوری انسانی زندگی، اس کی ساری استعدادِ فکر و عمل کو ایک نظام کے تحت کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا مذہب یا نظام بھی اسی قسم کے انداز میں انسانی فکر و عمل کے ہر دائرے میں اپنے نفوذ کے کچھ آداب و قوانین رکھتا ہے یا بنا ڈالتا ہے، تو اسے قرآنِ کریم کے مماثل نہیں بلکہ اس کے متوازی ایک الگ عمل ہی کہا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم کے متوازی مدعیانِ ہدایت ایک نہیں دس ہو سکتے ہیں، سوال تو "هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّوْرُ" (الرعد : ۱۶) کا ہے۔ ہر مسلمان کو عصرِ حاضر کے اس شیطانی مغالطہ سے آگاہ ہونا ضروری ہے، جس کی رُو سے اسلام کو دیگر ادیان یا فلسفہ ہائے حیات کی "مانند" ایک دین یا فلسفۂ حیات، قرآنِ کریم کو دوسری مذہبی کتابوں یا دساتیرِ عالم کی "مانند" ایک مذہبی کتاب

---

[1] الف لیلہ کا پیشرو ایک عربی قصّہ جسے حال ہی میں صلاح الدّین المنجد نے کسی قلمی نسخے سے مرتّب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں "عروس العرائس" نامی ایک مسحور کُن حسین و جمیل عورت کی داستان ہے جو اپنے حسن کی طرح اخلاقی بے راہ روی اور تباہ کن نحوست میں بھی بے مثل ہے۔ جو بھی اسے دیکھتا ہے فدا ہو جاتا ہے مگر وہ جہاں بھی قدم رکھتی ہے، بربادی لاتی ہے۔

یا دستور، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دوسرے بانیانِ مذاہب یا مشاہیر کی "مانند" ایک بانیٔ مذہب یا عظیم انسان (HERO) تسلیم کرنے پر اکتفا کر لینے کی تلقین کی جاتی ہے۔ قرآنی عظمت کو بظاہر اجاگر کرنے اور بباطن مٹانے کی ایک صورت یہ بھی اختیار کی جا رہی ہے کہ قرآن کے دعویٰ "بے مثلیت" میں اسے مدعی کی بجائے مدعا علیہ قرار دیا جا رہا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ اس "جیسا" اور اس کی "مانند" کوئی نہیں اب دانا دشمن اور نادان دوست استغنائیہ کے منحرف گواہ بن کر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآن عصرِ حاضر کے طاغوتی نظاموں کے عین "مانند" ہے اور وہ ان کے شانہ بشانہ چل سکتا ہے۔

ان حالات میں لازمی ہے کہ قرآنِ کریم کے فائق و برتر اور بے مثل و بے نظیر ہونے کو واضح کیا جائے۔ علمائے اسلام نے، جن میں سے بعض نے اعجاز القرآن کے موضوع پر مستقل تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جہاتِ مماثلت اور وجوہِ اعجاز سے بحث کرتے ہوئے لفظی و معنوی ہر دو جہات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان مباحث کو پڑھتے ہوئے بوصیریؒ کے مشہور نعتیہ قصیدہ (بُردہ) کا ایک مصرع "فجوھرُ الحسنِ فیہ غیر منقسمٖ" قرآنِ کریم پر صادق آتا دکھائی دیتا ہے۔ چند محدود صفات مل کر مجموعی طور پر اس کتاب کو بے مثل اور بے نظیر نہیں بناتیں، بلکہ خدا کی یہ کتاب اپنی ہر صفت اور ہر خوبی میں بے مثل اور بے نظیر کتاب ہے۔ جس طرح اس کا نازل کرنے والا لامحدود قدرتوں کا مالک ہے اسی طرح قرآنِ کریم کی صفات اور اس کے عجائبات بھی محدود نہیں۔ اشخاص و ادوار کے اختلاف کے لحاظ سے کسی کو ایک خوبی نمایاں نظر آئی تو کبھی دوسری اس سے بہتر معلوم ہوئی۔ مثلاً ابتداء میں قرآن کی عظمت و اعجاز کو اس کی فصاحت و بلاغت میں منحصر سمجھا جاتا رہا۔ یہ بات اپنی جگہ درست تھی۔ اور ہے ــــ مگر اعجازِ قرآن کا یہ پہلو کم از کم اب اکثریت کے ادراک اور شعور سے ماوراء ہے۔

اگر اس نقطۂ نظر سے غور کریں کہ قرآن نے پوری بشریت کو اپنی مثل لانے پر تحدی کی ہے، تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ قرآن تمام انسانی علوم و افکار کو چیلنج کرتا

ہے۔ تنہا فصاحت و بلاغت (شعری و نثری ادب) کو نہیں۔ ہر چند کہ فصاحت و بلاغت قرآن کا لباس ہے لیکن اصل تحدّی (چیلنج) مضامین و علوم کے ساتھ ہے۔ قرآنِ کریم نے خود اپنے اوصاف میں فصیح و بلیغ کلام ہونے سے زیادہ اپنے ھُدًی (ہدایت) حکمت، علم، بصائر، شفاء، رُوح، موعظہ، بُرہان، ذکر، نور، بیّنات وغیرہ ہونے پر زیادہ زور دیا ہے۔

اگر اس تفصیل کو اجمال کی طرف لائیں تو ساری بات کا لُبِّ لُباب اور محورِ بحث ایک لفظ "ہدایت" ہی نکلتا ہے۔ بلکہ آیاتِ تحدّی میں سے ایک میں تو واضح طور پر صرف مطلق مثل لانے کی بجائے جہتِ تحدّی کا صاف ذکر کر دیا گیا ہے۔ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا — یعنی قرآنِ کریم کتابِ ہدایت ہونے کے لحاظ سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ ہدایت سے مراد زندگی کے مقصد — اور نصب العین کا تعیّن اور اس نصب العین کو پا لینے کیلئے قطعی اور حتمی لائحہ عمل ہے اور اس کو ہم آج کل کی زبان میں تمام انسانی مسائل کا حل کہتے ہیں۔ اس ہدایت یعنی تمام مسائل کے حل کو پا لینے سے عقلِ انسانی کی عاجزی اور بے بسی کا اعتراف اب کوئی بے عقلی کی بات نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے کسی بھی "مِن دُونِ اللَّهِ" کا انسانی مسائل کے حل کے لیے کسی درجے میں بھی مثلِ قرآن ہدایت لانے سے عاجز ہونا ناقابلِ فہم بات نہیں ہے۔ البتہ آیت کے الفاظ "فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا" سے مادّہ پرست دانشوروں کی بجائے ادیانِ عالم کے پیروکاروں کے سامنے قرآن کی دعوت پیش کرنے کی اہمیّت واضح ہو جاتی ہے اس لیے کہ آیتِ کریمہ کے الفاظ سے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ قرآن کی ہدایت سے کسی درجے میں مماثلِ ہدایت کے ملنے کا امکان اگر کہیں ہو سکتا ہے تو وہ کسی "مِنْ عِندِ اللَّهِ" کتاب میں ہی ہو سکتا ہے کیونکہ قرآنِ کریم اور کُتُبِ سماویہ کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ ان میں ایک دوسرے کے معانی کی طرف رہبری کے علاوہ اُسلوب اور فصاحت و بلاغت میں بھی مماثلت کے امکانات موجود ہیں۔ اور شاید اسی لیے قرآنِ کریم نے اس

مقام پر تحدّی میں "فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ" میں مِثْلِهٖ کی بجائے "هُوَ اهدى منهما" کی شرط لگائی ہے۔ اس طرح قرآن کریم کی ان ساری چھ آیاتِ تحدّی کا مجموعی مضمون کچھ یوں بنتا ہے ـــــ "اے آسمانی ہدایت کے منکرو! اور عقل کا نام لے کر محض اپنی خواہشاتِ نفس کے پرستار دانشورو! تم ہدایت تو کیا ہدایت کی مشابہت سے بھی دُور ہی رہو گے ـــــ اور اے آسمانی ہدایت ماننے اور اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ انسانو! تمھیں یہ ہدایت قرآنِ کریم سے بہتر اور کہیں نہیں ملے گی۔"

عقلی رہنمائی کی بجائے عقل کی رہنمائی کے لیے آسمانی ہدایت کی ضرورت اب صرف تسلیم ہی نہیں کی جا رہی بلکہ آج کا انسان اس کی تلاش میں ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی دیگر صُحفِ سماویہ یا الہامی کتابوں پر فضیلت اور برتری کے پہلوؤں پر زور دیا جائے ـــــ یہ وقت کی ضرورت ہے۔

قرآنِ کریم کی برتری صرف اس بات میں نہیں کہ وہ عقلی رہنمائی سے بہتر رہنمائی دیتا ہے ـــــ ہدایت کے معاملے میں اب عقل کو بھی ایک "مفلوج اور مغلوب دیو" سمجھا جانے لگا ہے[1] ـــــ قرآنِ کریم کی عظمت و اعجاز کا سب سے اہم نہیں تو بہت اہم پہلو یہی ہے کہ وہ عقلِ انسانی کی رہنمائی کرنے والی مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابوں میں بھی سب سے بہتر ہدایت یا انسانی مسائل کے بہتر حل کا حامل ہے۔ اس کتاب مہیمن کو صُحفِ سماویہ یا الہامی کتابوں پر کئی اور لحاظ سے بھی فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ ان میں سے کئی پہلو ایسے بھی ہیں جن کی وضاحت بذاتِ خود مستقل تصنیف یا مقالہ کی محتاج ہے اور بعض پر تو کتابیں موجود ہیں۔ یہاں صرف ابتدائی خاکے کے طور پر صُحفِ سماویہ پر قرآنِ کریم کی فضیلت و برتری کے چند اہم پہلوؤں کے عنوانات کا ذکر کیا جاتا ہے اور اہلِ علم سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ان عنوانات کو اپنی تحقیق اور ریسرچ کا موضوع بنائیں۔

---

[1] ان ہی دنوں اخبارات میں شاہِ ایران کا امریکہ کے متعلق اسی قسم کا مشہور ریمارک آیا تھا۔

(۱) اپنی پوزیشن (کتاب اللہ ہونے کے لحاظ سے) کی اندرونی شہادت اور وضاحت
(۲) لانے والے کے ساتھ نسبت کی ظنیّت یا قطعیّت۔
(۳) لانے والے کی شخصیّت اور کردار کے مطالعہ کا مواد۔
(۴) آغازِ نزول سے آج تک پوری تاریخ کی حفاظت۔
(۵) متن کی حفاظت کے انتظامات اور اُس کے نتائج۔
(۶) تحریف و اتلاف اور حک و اضافہ سے حفاظت۔
(۷) زبانِ نزول کا زندہ و تابندہ رہنا۔
(۸) شُستہ اور مہذّب اُسلوب (فحش اور حیاسوز عبارتوں سے پاک ہونا)
(۹) جامعیت اور عالمگیریّت کا دعویٰ
(۱۰) دعوئ تکمیلِ ہدایت (کسی آئندہ ہدایت کا محتاج نہ بنانا)
(۱۱) علمِ صحیح اور فطرتِ صحیحہ سے متصادم نہ ہونا (ناقابلِ عمل احکام سے پاک ہونا)
(۱۲) برپا کردہ انقلاب کی کیفیّت۔
(۱۳) بنیادی انسانی اقدار کے فروغ میں انسانی تہذیب و تمدّن پر اثرات۔

بقیہ "افہام و تفہیم" (ص ۸۷ سے آگے)

کے ذریعہ اظہارِ دین حق علی الدّین کُلّہ کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اپنے اندر کوئی داعیہ اور عزم موجود پاتے ہوں تو ایسے لوگوں کو ہم تنظیم اسلامی کی دعوت اور طریق کار کو سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں تنظیم کا دستور میثاق کے اگست ۷۵ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے اور کتابی شکل میں بھی دستیاب ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ۔

مولانا امین احسن اصلاحی
کا ڈاک کا پتہ
چک ۴ رحمٰن آباد۔ ڈاک خانہ مانگٹ، تحصیل و ضلع شیخوپورہ

افہام و تفہیم

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نام بہت سے استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ موصوف کو تعلیم و تعلم قرآن اور درس و تدریس نیز تقریباً ہر ماہ مختلف مقامات کے دُوروں کی وجہ سے اتنی مہلت و فرصت میسر نہیں آتی تھی کہ وہ ان استفسارات کے جوابات تحریر کر سکیں۔ اب یہ شعبہ راقم الحروف کے سپرد کیا گیا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ استفسار و استصواب کے ذاتی طور پر بھی جوابات دیئے جائیں اور ان میں سے منتخبہ سوال و جواب قارئین میثاق کے استفادہ کے لئے اس عنوان کے تحت شائع بھی کئے جائیں۔ (ج۔ ر)

رُوح کے متعلق "رُوح" کا صحیح نظریہ کیا ہے؟ کیا رُوح بھی موت کے بعد جسم کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے؟ اگر نہیں! تو رُوح کہاں جاتی ہے؟ اکثر فلاسفہ اور سائنس دان "روح" کے علیحدہ تشخص کے قائل نہیں، اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے۔ وہ بڑے عقلی و منطقی دلائل دیتے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔ (محمد جاوید خاں، داؤد خلیل)

جواب قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے مطالعہ سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جسم اور روح دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ انسان کے جسد خاکی کا تعلق عالم سفلی سے ہے چنانچہ قرآن حکیم نے انسان کی تخلیق کے مختلف مدارج کا متعدد اسالیب سے جو نقشہ کھینچا ہے، اس کا مفاد یہی ہے۔ اور روح کا تعلق عالم علوی سے ہے لہٰذا سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ اور وہ تم سے رُوح کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم میں سے ہے اور تمہیں تو بس تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے۔ (بنی اسرائیل۔ ۸۵)

علمائے دین کے نزدیک اصل صورت حال یہ ہے کہ انقطاعِ جسم و روح کا دوسرا نام موت، ہے۔ جس کے بعد جسم جو خاکی الاصل ہے، مٹی میں رل مل جاتا ہے اور روح جو نوری الاصل ہے، عالم بالا کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ حشر ونشر حساب وکتاب اور عدالتِ اُخروی کے قیام تک رُوح جس مقام پر رکھی جاتی ہے اس کو حدیث شریف میں عالم برزخ، کہا گیا ہے، جس کی صحیح کیفیت کا کامل و اکمل علم صرف اس ہستیؒ کو ہے جو وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ کی صفت سے متصف اور وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کی شان کی حامل ہے۔ رُوح کی ماہیت اور اس بات کو سمجھنا کہ جسم انسانی میں اس کا مستقر کون سا مقام ہے، اس عاجز کی رائے میں وہ انسان کے 'محدود علم' سے ماورا ہے۔ جیسا کہ اشارہ موجود ہے اللہ تعالےٰ کے اس فرمان میں۔ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝۔ ان امور پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ چونکہ ان کی خبر دی ہے صادق المصدوق نے صلی اللہ علیہ وسلم۔ رہا فلسفیوں، منطقیوں اور سائنسدانوں کے 'نظریات' کا معاملہ! تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر یہ نظریات قرآن مجید اور احادیث شریف سے مطابقت نہیں رکھتے تو سراسر باطل اور ضلالت ہیں اور کسی طور بھی قابلِ التفات نہیں ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے کتابچہ عظمتِ صوم میں جسم و روح کے تعلق کے متعلق ضمنی بحث آئی ہے۔ اس کا مطالعہ ان شاء اللہ کافی حد تک مفید مطلب ہوگا۔

یزیدؒ بن معاویہؓ کے متعلق

محترم جناب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (ایک مشہور عالم دین) کی ایک کتاب زیر مطالعہ ہے۔ جس میں "ملعون یزید" کے الفاظ تحریر ہیں۔ کیا اہل سنت اس قسم کی دریدہ دہنی کو جائز تصور کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ (محمد جاوید ۔ مغلپورہ)

جواب

تاریخ ہمارا موضوع نہیں۔ ہم جو دعوت لے کر اُٹھے ہیں، اس کا تعلق دعوت الی اللہ، اعلائے کلمۃ الحق ۔ اظہارِ دین الحق اور دعوت رجوع الی القرآن سے ہے۔ جو منبع و سرچشمہ یقین و ایمان ہے اور ملت مسلمہ کے دینی، اخلاقی، سیاسی، فکری انحطاط و زوال کا اصل سبب یہ ہی ہے کہ ہم مسلمانوں کا تعلق اس نسخۂ شفا سے نہ صرف کمزور بلکہ منقطع ہو چکا ہے۔ جو کچھ ہے وہ یا حصول ثواب کے لئے یا ایصال ثواب

کے لئے باقی ہے۔ الّا ماشاء اللہ۔ آپ کے سوال کے جواب میں راقم الحروف اپنے ذاتی لیکن حقیر سے مطالعہ کی بنیاد پر یہ عرض کرتا ہے کہ مستند احادیث کی کتابوں میں ایک حدیث بیان ہوتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ صادق المصدوق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجاہدین کے مغفور ہونے کی بشارت دی ہے جو قیصر روم کے دارالحکومت "قسطنطنیہ" پر یلغار کریں گے۔ مزید براں مستند تاریخ کی کتابوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جناب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کے جس مجاہدین کے لشکر نے پہلی بار قسطنطنیہ پر یلغار کی تھی، اس کے سپہ سالار لشکر جناب یزیدؒ بن معاویہؓ تھے اور اس لشکر میں ان کی کمان میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی اپنی پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود نہایت اصرار کے ساتھ شریک ہوئے تھے تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے مطابق مغفور ہونے کی سعادت حاصل فرمائیں اسی معرکہ میں قسطنطنیہ کی فصیل کے باہر آپؓ کا انتقال ہوا۔ علاوہ ازیں ان کے علاوہ بہت سے مشہور صحابہ کرام جیسے حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ، حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ بن علیؓ رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین بھی اس لشکر میں جناب یزیدؒ کی ماتحتی میں شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت کے معتمد ائمہ محدثین و فقہا جناب یزیدؒ پر زبانِ طعن و لعن دراز کرنا صحیح نہیں سمجھتے۔ راقم کے نزدیک ملت کے ان گل ہائے سرسبد کی تحقیق اور رائے ہی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ اسی میں عافیت ہے۔ واللہ اعلم۔

تنظیم اسلامی کے متعلق

جناب ڈاکٹر صاحب سلام مسنون۔

میں اور میرے چند دوست آپ کے درس قرآن اور تقاریر میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو قرآن حکیم کے رموز کے بیان پر بڑی قدرت دی ہے۔ آپ کے درس اور تقریر کا دل پر کافی اثر ہوتا ہے۔ لیکن ایک بات کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ آپ کے ہر درس و خطاب میں عموماً مرکزی موضوع کے طور پر یہ بات بیان ہوتی ہے کہ ہر مسلمان پر حسب استعداد اقامتِ دین کی سعی و جہد فرض ہے۔ جس کو قرآن حکیم میں کہیں اعلائے کلمۃ الحق، کہیں اظہار دین الحق اور کہیں تواصی بالحق کی اصطلاحات میں بیان

کیاگیاہے ۔سوال یہ ہے کہ ایک مشہور ومعروف دینی جماعت یعنی جماعت اسلامی کا نصب العین بھی یہی ہے اور وہ پاکستان میں تقریباً انتیس ۲۹ سال سے یہی جدوجہد کررہی ہے تو آپ اس جماعت کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے آپ نے تنظیم اسلامی کے نام سے علیحدہ جماعت کیوں بنائی ہے ؟ جبکہ معلوم ہوا ہے کہ پہلے آپ اس جماعت کے رکن رہے ہیں بعد میں علیحدہ ہوئے ہیں ۔میرے حلقہ احباب میں یہ کھٹک موجود ہے کیا آپ اس الجھن کو دور فرمائیں گے ؟ (محمد سلیم ۔کراچی)

جواب آپ کا یہ سوال انتہائی تفاصیل کا محتاج ہے ۔جس کے لئے اس عنوان کے محدود صفحات کفایت نہیں کرسکتے ۔ہم آپ کو مسئلہ کے سمجھنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی تالیف "تحریک جماعت اسلامی ۔ ایک تحقیقی مطالعہ" کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے جماعت اسلامی کے رکن کی حیثیت سے ایک بیان کی صورت میں مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا اور جو مذکورہ بالا نام سے ۱۹۶۶ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے ۔مزید براں اس بات کے سمجھنے کے لئے ماہنامہ میثاق کے ماہ ستمبر ۔اور اکتوبر و نومبر ۱۹۷۴ء نیز ماہ اگست ۱۹۷۶ء کے شماروں کا مطالعہ بھی مفید مطلب ہوگا ۔ نیز موجودہ شمارے کا تذکرہ و تبصرہ بھی ۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۹۴۱ء کے آغاز میں "جماعت اسلامی" کے نام سے قرآن کی دعوت جہاد و انقلاب، اس صدی میں تجدید و احیائے دین کیلئے بالکل صحیح اور ہمہ گیر تحریک برپا ہوئی تھی ۔جس نے (تھوڑے سے عدم توازن کے ساتھ)[1] کتاب و سنت کی روشنی میں نصب العین بھی متعین کیا تھا اور امت مسلمہ کے انحطاط و زوال اور فلاکت و پستی کی بالکل صحیح تشخیص کر کے قرآن اور اسوۂ رسولؐ کے مطابق طریق کار بھی بالکل صحیح متعین کیا تھا ۔یعنی یہ کہ ہماری قوم کا سواد اعظم دراصل "نسلی مسلمانوں" پر مشتمل ہے الا ماشاء اللہ ۔ پہلے اس چیز کی ضرورت ہے کہ ان "نسلی مسلمانوں" کو "اصلی مسلمان" بنانے کی ہمہ گیر تحریک برپا ہو تاکہ حقیقی ایمان کی

---

[1] اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو ان شاء اللہ اس عدم توازن کے موضوع پر آئندہ کسی موقع پر مفصل گفتگو کی جائے گی ۔ [2] "نسلی مسلمان" اور "اصلی مسلمان" دونوں اصطلاحات جماعت اسلامی ہی کی ہیں ۔

کشتِ قلوب میں تخم ریزی ہوسکے۔ جس سے غلط افکار کی تطہیر اور سیرت و کردار کی اسلام کے مطابق تعمیر ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعتِ اسلامی ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کی قومی تحریک "مطالبہ پاکستان" اور اس مطالبہ کی علمبردار مسلمانوں کی "قومی تنظیم" مسلم لیگ سے نہ صرف بے تعلق رہی بلکہ اس کے طریق کار اور اس کے قائدین کے نظریات و افکار حتیٰ کہ کردار کے متعلق بھی خالص اسلام کی روشنی میں بے لاگ تنقید کرتی رہی ہے[1]۔ جماعت اسلامی نے متحدہ ہندوستان میں ۱۹۴۷ء تک اپنے لٹریچر، اپنے حلقہ ہائے درس قرآن اپنی اصول پسندی اور اسلام کی انقلابی دعوت کے ذریعے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تعلیم یافتہ اصحاب کے نہ صرف افکار بدلے بلکہ کردار بھی تبدیل کر دیئے اور ان متاثرین میں سے وہ جان فروش کارکن بھی میسر آگئے جو تن من دھن سے جماعت اسلامی کی انقلابی اسلامی دعوت کے مخلص سپاہیوں کی صف میں داخل ہو گئے (کارکنان کی تعداد قیام پاکستان تک سات آٹھ سو افراد سے متجاوز نہیں تھی) کارکن ہمدردوں کا بھی ایک وسیع حلقہ پیدا ہوگیا۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی کچھ مہینوں تک اسی طریق کار پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن پاکستان کے دستور کو 'اسلامی دستور' بنوانے کے لئے جب جماعت نے عوامی طرز کی مہمات کا آغاز کیا اور اس کو مقبولیت حاصل ہوئی نیز "قرارداد مقاصد" قومی اسمبلی میں منظور کرلی گئی۔ (جس میں جماعت کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ دوسرے موثر عوامل جیسے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اور مسلم لیگ کے دیگر اسلام دوست مخلص زعماء کی مساعی شامل تھے) تو جماعت اسلامی نے اپنے اثر نفوذ کے بارے میں مغالطہ اور اپنی طاقت کے بارے میں غلط اندازوں میں مبتلا ہو کر اپنے طریق کار میں بنیادی تبدیلی کرلی اور وہ رفتہ رفتہ خالص ہنگامی مسائل اور وقتی سیاست میں الجھ کر رہ گئی اس نے یہ سمجھ لیا کہ جس طرح نعروں اور جلسے، جلوسوں کے ذریعہ پاکستان قائم ہوگیا تھا اور قرارداد مقاصد

[1] اس بات کو سمجھنے کے لئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی کی معرکۃ الآرا تصنیف "سیاسی کشمکش حصہ سوم" کا مطالعہ مفید مطلب ہوگا۔ جس کو جماعتِ اسلامی کے تاسیس میں بہت بڑا دخل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ "رسائل و مسائل" حصہ اول میں وقت کی سیاست پر جو مولانا موصوف کی آرا آئی ہیں۔ ان کا مطالعہ بھی مسئلہ کی تفہیم میں ممد ہوگا۔

منظور کرالی گئی تھی، اسی طریق کار پر عمل پیرا ہو کر الیکشن کے ذریعہ قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر کے حکومت کے ذرائع و وسائل سے کام لے کر اسلامی نظام کو قائم و نافذ کیا جا سکتا ہے، لہٰذا جب سے جماعت پر خالص اسلامی اصولی انقلابی دعوت کا رنگ پھیکا ہونا اور سیاسی رنگ غالب آنا شروع ہو گیا۔ اس موقع پر بہت سے اصول طاق نسیان پر رکھ دیئے گئے، جن کا پرچار جماعتِ اسلامی ۱۹۴۱ء سے کرتی چلی آ رہی تھی یعنی یہ کہ ایک معاشرہ کی مثال دراصل 'دودھ' کی ہوتی ہے۔ جیسا دودھ ہوگا۔ ویسا ہی اس سے مکھن حاصل ہوگا۔ اگر دودھ سم آلود ہو تو اس سے حاصل شدہ مکھن اپنی سمیت میں دودھ سے بھی زیادہ ہلاکت خیز ہوگا۔ پھر صادق المصدوق حتمی المرتبت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو کہ کسی معاشرہ کی قیادت دراصل اس معاشرے کے اخلاقیات، نظریات، اور سیرت و اعمال کا مظہر ہوتی ہے۔ اس جامع اور مختصر ارشاد میں بیان فرمادیا کہ اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ۔ تمہارے اعمال ہی دراصل تمہارے عُمّال (حاکموں) کا روپ دھارتے ہیں۔ جماعت اسلامی نے ۱۹۵۱ء میں اس حدیث مبارکہ کی خوب نشر و اشاعت بھی کی تھی حقیقت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر مگر جامع ارشاد گرامی پر پولیٹیکل سائنس کے ضمن میں اب تک کی ساری ریسرچ قربان کی جا سکتی ہے ——— لیکن اس ارشاد کو بھی پس پشت ڈال کر الیکشن کے ذریعہ 'صالح قیادت برپا کرنے' بہ الفاظ دیگر جماعتِ اسلامی کے برسر اقتدار آنے کے خواب دیکھے جانے لگے اور جماعت کی تگ و دو اور سعی و جہد کا رُخ الیکشنی سیاست کی طرف مُڑ گیا۔ چند دردمندوں نے اس انتقال و انحراف موقف کو محسوس کیا اور پوری دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ کوشش کی[1] کہ جماعتِ اسلامی وقتی و ہنگامی سیاست کی خاردار وادی میں الجھنے کی بجائے اپنے اصل موقف یعنی اسلام کی انقلابی دعوت و تبلیغ کی طرف مراجعت کرے۔ لیکن وائے حسرتا! یہ کوشش ناکام ہوئی اور فروری ۱۹۵۷ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں ارکانِ جماعت کی عظیم ترین اکثریت نے امیر جماعت کی اختیار کردہ الیکشنی طریق کار اور پالیسی کی توثیق و تصویب

---

[1] اس کوشش میں ڈاکٹر صاحب موصوف صاحب بھی پیش پیش تھے۔

کر دی ہے جس کے متصلاً بعد جماعت میں ایسی فضا پیدا کر دی گئی کہ وہ ارکان جنہوں نے اس طریق کار سے اختلاف کیا تھا ۔ جماعت میں رہنے نہ پائے ۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں ثابت ہو گیا کہ جماعت اسلامی نے اپنے لئے جو راہ متعین کی تھی ، وہ صحیح نہیں تھی ۔ اس الیکشن کے متعلق یہ بات ہر کس و ناکس تسلیم کرتا ہے کہ اس میں حکومت کی مشینری بالکلیہ غیر جانب دار رہی تھی ——— چاہیئے تو یہ تھا کہ اس "تدبیر" کی ناکامی کے بعد جماعت اپنے موقف پر نظر ثانی کرتی اور وقتی و ہنگامی سیاست سے کنارا کش ہو کر قرآن و سنت سے اخذ کردہ طریق کار کو اختیار کرنے کی طرف رجوع کرتی اور پہلے معاشرے میں ان اساسات یعنی ایمان باللہ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کو قائم کرنے کی سعی و جہد کے لئے اپنی تمام توانائیاں صلاحیتیں اور وسائل لگا دیتی کہ جن کی تاسیس کے بغیر نہ فکر و نظر میں انقلاب آ سکتا ہے نہ سیرت و کردار میں کوئی مؤثر تبدیلی آ سکتی ہے اور نہ ہی وہ اسلامی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے ، جس میں سے صالح قیادت ابھر سکے اور اللہ کا دین عملاً قائم ہو سکے ۔ جس معاشرہ کا یہ عالم ہو کہ ۹۰ فیصد افراد ان فرائض دینی سے نہ صرف غافل بلکہ ان کے تارک ہوں جو خالصتاً انسان کی انفرادی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی نماز ۔ زکوٰۃ ۔ روزہ وغیرھم) اور جس کی ادائیگی میں اب تک کوئی بھی نظام حکومت کم از کم پاکستان کی حد تک حائل نہیں ہوا ۔ جس معاشرہ کا یہ حال ہو کہ اس کی کم و بیش (۳/۴) تین چوتھائی اکثریت مشرکانہ و مبتدعانہ عقائد و اعمال ہی کو اصل دین سمجھتی ہو ۔ جس میں عرس ، قبر پرستی ، سوئم ، چہلم ، استعانت غیر اللہ جیسی معصیتیں نیکی اور بِر کا مقام رکھتی ہوں اس معاشرہ کو بلو کر جو قیادت ابھرے گی وہ اعمالکم عمالکم کے قول فیصل کے عین مطابق ہو گی اور اس پر یہ بات بالکل صادق آئے گی کہ جیسا دودھ ہو گا ویسا ہی مکھن حاصل ہو گا ۔

لے خیال رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ۵۶ء میں چودھری محمد علی صاحب کی وزارت عظمیٰ کے دور میں پاکستان کا دستور مدون ہو کر نافذ ہو چکا تھا اور اس بات کا روشن امکان تھا کہ جلد ہی اس دستور کے تحت ملک میں عام الیکشن ہوں گے ۔ اکابر جماعت کو توقع تھی کہ وہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں اتنی موثر کامیابی حاصل کرے گی کہ ایک مضبوط حزب اختلاف (Opposition) بنا سکے

برصغیر پاک و ہند میں جماعتِ اسلامی کی تاسیس کے وقت ملک میں مسلمانوں کی دینی، ملّی، قومی جماعتوں، جمعیتوں، لیگوں اور پارٹیوں کی کوئی کمی نہیں تھی، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فکر اور نظریہ اور استعداد کے مطابق کسی نہ کسی نوع کی خدمت میں مشغول و مصروف اور سرگرم عمل تھی۔ کمی تھی تو ایک ایسی حزب اللہ کی جو قرآن کی دعوتِ جہاد و انقلاب، کی طرف پکارے اور مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا اصل سبق یاد دلائے کہ تم کو ایک اُمّت شہادت حق علی الناس کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے بنایا گیا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط جماعتِ اسلامی اسی دعوت کی داعی بن کر اٹھی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں وہ واحد جماعت تھی، جس نے اسلام کی آفاقی دعوت کو قوم پرستی کے اس پرفتن دور میں مومنانہ جرأت کے ساتھ پیش کیا تھا اور مسلمانوں کو للکارا تھا کہ وطن پرستی، قوم پرستی حاکمیت غیر اللہ نہ صرف خلاف اسلام ہیں بلکہ خالصتاً شرک ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تکمیلی مقصد اظہار دین حق علی الدین کلہ اور لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ہے اُمت مسلمہ کے ہر فرد فرد کو اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیئے۔ اور ان کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی سے منافقت و تناقض دُور کرنا چاہیئے اس اصلاح کا اوّلین دائرہ انفرادی زندگی سے شروع ہوگا۔ جماعتِ اسلامی کے انتقال و انحراف موقف کے بعد یہ محاذ جواز روئے قرآن و حدیث اساسی محاذ ہے خالی پڑا ہے۔ الیکشنی سیاست کے ذریعہ تبدیلی قیادت کے لئے فی الوقت بہت سی جماعتیں، جمعتیں، لیگیں، اور پارٹیاں سرگرم عمل ہیں۔ کسی کے منشور میں اقامت دین، بطور نعرہ شامل ہے تو کسی کے نظام مصطفےٰ، کوئی اسلامی جمہوریت کی علم بردار ہے تو کوئی 'اسلامی سوشلزم' کی۔ حصول اقتدار کے لئے مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اور الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے عوامی طرز کے بہت سے 'دینی'، 'تبلیغی'، اور رفاہی کام بھی ہو رہے ہیں۔ عوام کی خوشنودی اور تائید اپنی پارٹی کے حق میں حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن سعی کی جا رہی ہے۔ ان پارٹیوں میں بلاشبہ جماعتِ اسلامی سب سے زیادہ منظم پارٹی ہے۔ جس کی پشت پر وسیع فکری لٹریچر اور مخلص کارکنوں کی ایک

ٹیم موجود ہے۔ لیکن بدایں ہمہ نہایت دکھ کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت یہ عرض ہے کہ اُس "جماعت اسلامی" کا جس کی تاسیس ۱۹۴۱ء میں ایک انقلابی اصولی اسلامی جماعت کی حیثیت سے ہوئی تھی، اب کہیں وجود نہیں ہے۔ اب موجودہ جماعت ایسی ہی ایک نیم دینی اور نیم سیاسی پارٹی بن کر رہ گئی ہے، جیسی اور بہت سی فعال پارٹیاں ملک میں موجود ہیں اس کے کام کا بھی وہی طرز ہے جو ہر جمہوری ملک میں حزب اختلاف کا ہوتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ ایوبی دور سے اب تک کبھی صدارتی کے بجائے پارلیمانی نظام کے قیام، کبھی جمہوریت کی بحالی کے نام سے یہ اُصولی جماعت، کتنی قلابازیاں کھا چکی ہے۔ اس نے ان پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کیا جو کھلم کھلا سیکولر (لادینی) نظام کی علمبردار یا سوشلسٹ نظام کی حامی تھیں۔ ان میں وہ پارٹیاں بھی تھیں جو صوبائی عصبیتوں میں مبتلا تھیں۔ غرض کہ حصول اقتدار کے لئے اس جماعت نے اُن جماعتوں کے ساتھ بار بار متحدہ محاذ تشکیل دیئے اور یہ سلسلہ جاری ہے جن میں سے بعض اسلامی نقطۂ نظر سے بدنام، دنیا اور مفاد پرست نیز بے اصول جماعتیں تھیں اور ہیں۔ اس نے اسلام کے اس اٹل اصول کو پس پشت ڈال دیا کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو نظر انداز کر دیا جس کا مفہوم ہے کہ "وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پا سکتی جس کے معاملات عورتوں کے ہاتھ میں ہوں"۔ عوام کی خوشنودی اور ووٹوں کے حصول کی طلب کے باعث جماعت اسلامی خالص اسلام کی دعوت سے نہ صرف مداہنت برتنے پر مجبور ہو گئی ہے بلکہ ان مشرکانہ اور مبتدعانہ اعمال کی مرتکب بھی ہونے لگی ہے، جس میں عوام کی اکثریت مبتلا ہے۔ اب جلسوں اور جلوسوں میں نعرہ رسالت (یا رسول اللہ) لگانے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ قومی اسمبلی میں جماعت اسلامی کے گروپ کے قائد پاک پٹن میں جماعت کے کارکنوں کے ساتھ ایک بزرگ کے مزار کی زیارت کے لئے جاتے ہیں اور مزار پر "چادر" چڑھاتے ہیں[1] "میلاد شریف" کے نام سے مجالس کا انعقاد اور درود و سلام

[1] راقم الحروف اس بات کی "طاہر ویکلی" لاہور کے (جس میں یہ رپورٹ چھپی تھی) محترم مدیر اعلیٰ جناب مجیب الرحمٰن شامی کی موجودگی میں جناب مسعود ساحر صاحب سے ملکر (جو اس دورے میں ساتھ تھے اور جنہوں نے یہ رپورٹ لکھی تھی) اس امر کی تصدیق کر چکا ہے کہ مزار پر چادر چڑھائی گئی تھی

کے وقت باقاعدہ "قیام" ہوتا ہے[1]۔ آپ خود غور کیجئے کہ اس نوع کے "اسلام" کی علمبردار تو دوسری جمعیتیں بھی موجود ہیں۔ پھر جماعتِ اسلامی کے علیحدہ تشخص کی کیا ضرورت ہے!

دراصل تنظیم اسلامی تجدید و احیائے دین کی اُسی قرآنی انقلابی دعوت، کا علم لے کر کھڑی ہوئی ہے۔ جس کی سعادت و توفیق ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کو ملی تھی۔ اس تنظیم کا مقصدِ قیام دراصل جماعتِ اسلامی کے متروکہ موقف کی تجدید ہے اور اس کا نصب العین اور طریق کار قرآن حکیم کے فرامین و ہدایات اور اُسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مبنی ہے جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ . . . . . .

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ . . . . . .

ہمارے نزدیک مسلم معاشرہ کی معتدبہ تعداد کی کشتِ قلوب و اذہان میں یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ ہی کے ذریعہ خالص توحید کی اساس پر ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی تخم ریزی اور فکر و نظر کی تطہیر ہو سکے گی۔ اسی تلاوتِ آیاتِ الٰہی کے عمل سے "تزکیہ" ہو سکے گا اور اسلام کے مطابق سیرت و کردار کی تعمیر اور زندگیوں میں انقلاب آسکے گا۔ اس کے بعد درجہ آئے گا تعلیم کتاب (نفاذِ شریعت) کا اور اسکی حکمتوں کا ——— بہرحال اس ملک میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق دین کی خدمت کی توفیق بہت سی جماعتوں کو حاصل ہے جن میں جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت خاص طور قابلِ ذکر ہیں۔ جن حضرات کو ان جماعتوں کے موجود طریق کار پر شرحِ صدر حاصل ہے اور حاصل ہو، ان کا فرضِ دینی ہے کہ وہ ان جماعتوں کے ساتھ مخلصانہ تعاون کریں اور جن کا ان جماعتوں کے طریق کار پر اطمینان نہ ہو اور وہ خالصتہً اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار کردہ اساسی طریق کار یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

[1] یہ بات بھی جماعتِ اسلامی کے معتمد علیہ حضرات سے تصدیق کے بعد سپردِ قلم کی گئی ہے۔

(بقیہ صـ ۷۷ پر)

قرآنی تربیت گاہ

(منعقدہ راولپنڈی از ۸ راگست تا ۱۵ راگست ۱۹۷۶ء)

ایک رپورتاژ

از قلم :- قاضی عبدالقادر (کراچی)

ایک بجنے میں چند منٹ ابھی باقی تھے جب ہم یتیم خانہ میں داخل ہوئے، یہ راولپنڈی کی ایک خوشگوار دوپہر تھی، مطلع جزوی ابر آلود تھا، سورج بادلوں کی اوٹ سے کبھی جھانکتا اور پھر چھپ جاتا، جیسے وہ ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہو ـــــ ہم بائیس ساتھی تھے جو ایک ساتھ یتیم خانہ میں داخل ہوئے ـــــ ہم میں یتیم بھی تھے اور یتیموں کے بیٹے بھی ـــــ چار ساتھی کراچی کے اور اٹھارہ لاہور کے جو ابھی ابھی پسنجر ٹرین سے لاہور سے آئے ہیں اور وہ دیکھیے سامنے کھڑے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا استقبال کر رہے ہیں۔

مری روڈ پر راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان یہ انجمن فیض الاسلام کا یتیم خانہ ہے جو دار الشفقت کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی عمارات میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام آٹھ روزہ قرآنی تربیت گاہ منعقد ہو رہی ہے جو آج ۸ راگست بروز اتوار سے شروع ہو کر ۱۵ راگست بروز اتوار کو اختتام پذیر ہو گی۔ ہم سے پہلے بھی کچھ رفقاء یہاں پہنچ چکے ہیں اور کراچی، سکھر اور دیگر شہروں سے مزید رفقاء پہنچنے والے ہیں۔ بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے ذرائع آمد و رفت درہم برہم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو رہی ہے۔

جمعہ کی شام کو پانچ بجے ہم چار رفقاء کراچی سے بذریعہ سُپر ایکسپریس لاہور روانہ ہوئے تھے بھائی مسرور حسین صدیقی ہمارے امیرِ سفر تھے۔ دیگر دو ساتھی چوہدری عبدالمقتدر صاحب اور آصف علی رضوی تھے۔ راستہ خوب کٹا، سفر کا احساس تک نہ ہوا، اور کیوں ہوتا، جہاں سفر میں چند ساتھی ہوں اور وہ بھی ایک مقصد کے ساتھی، اور مقصد بھی اس کائنات کا سب سے اعلیٰ مقصد، وہاں سفر کا احساس کیوں ہوتا! ـــــ میں نے ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا کہ میرے ساتھیوں نے نہ صرف ایک دوسرے کے لیے اپنا آرام تج دیا بلکہ خود تکلیف اٹھائی اور دوسرے مسافروں کو آرام پہنچانے کی کوشش کی ـــــ گاڑی لیٹ

تھی۔ اُسے صبح سوا نو بجے لاہور پہنچنا تھا لیکن وہ ساڑھے گیارہ بجے پہنچی۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مع چند رفقاء کے دو روز قبل ہی انتظامات کے سلسلہ میں راولپنڈی جاچکے تھے اس لیے اسٹیشن پر ہمارے استقبال کے لیے ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے عزیزم عارف رشید اور چند دیگر رفقاء موجود تھے ——

عارف رشید ایک صالح اور ذہین نوجوان ہے، میڈیکل کالج کا طالب علم ہے، رفقاء کی خدمت میں باپ سے زیادہ مستعد رہتا ہے ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ڈاکٹر صاحب نے جب تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن کا عَلَم ہاتھ میں سنبھالا تو اپنی پریکٹس کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ عارف میاں کو جب ڈاکٹر صاحب میڈیکل کالج میں داخلہ دلانے لگے تو بڑے بھولپن سے باپ سے کہا کہ "ابّا جان! جب کام مجھے وہی کرنا ہے جو آپ کر رہے ہیں تو ڈاکٹر بننے سے فائدہ؟" ——

ہاں تو میاں عارف رشید کی سوزوکی میں بیٹھ کر ہم ۱۲۔ افغانی روڈ پہنچ گئے —— کھانا تیار تھا خوب سیر ہو کر کھایا —— ڈاکٹر صاحب جتنی سادہ طبیعت کے مالک ہیں اُن کے گھر میں اُس سے کہیں زیادہ سادگی ہے۔ انہوں نے اپنا معیارِ زندگی پہلے ہی کہاں بلند رکھا تھا، لیکن جب تحریکِ رُجوع اِلی القرآن کا آغاز کیا تو اپنے معیار کو اور کم کیا اور "تنظیم اسلامی" کے قیام کے بعد تو اُسے اور گھٹایا اور گھٹایا ——

مجھے تعجب ہوا یہ دیکھ کر کہ اُن کے ہاں نہ تو کوئی ڈائننگ ٹیبل ہے، نہ کوئی صوفہ سیٹ ہے۔ حد یہ ہے کرسی سیٹ تک نہیں، ڈنر سیٹ کا تو ذکر ہی کیا! گھر کے لوگ ہوں یا مہمان، کھانا یا تو پلنگ پر بیٹھ کر کھاتے ہیں یا پھر نیچے چٹائی پر بیٹھ کر —— ڈاکٹر صاحب کی ذاتی زندگی کا یہ ایک پہلو ہے، شاید ڈاکٹر صاحب اسے صفحۂ قرطاس پر لانا پسند نہ فرمائیں ؎

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی!
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں!

ایسے میں مجھے وہ علمائے دین یاد آجاتے ہیں جن کے ڈرائنگ روموں کی چمک دمک دنیادار لوگوں تک کو شرما جاتی ہے، جن کے اعلیٰ افرنگی صوفے، جن کے ایرانی قالین، جن کے گھر کی نفیس کراکری کہاں سے آتی ہے کس طور سے آتی ہے، آپ کیا جانیں ؎

ہم کو تو میسّر نہیں مٹی کا دیا بھی!
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!

سہ پہر جو بارش شروع ہوئی تو رکنے کا نام نہیں لیتی- لاہور کے رُفقاء نے راولپنڈی جانے کے لیے ایک بس کا انتظام کیا ہوا تھا اور طے یہ ہوا تھا کہ بس راولپنڈی سے لاہور آ کر اور اڈّہ پر مسافر اتار کر شام کو آٹھ بجے ۱۲- افغانی روڈ آجائے گی اور ہم بھی لاہور کے رفقاء کے ساتھ اُسی بس میں سوار ہو کر راولپنڈی جائیں گے- لیکن نو- بج رہے ہیں اور بس ابھی تک نہیں پہنچی ـــــ بعد میں یہ پتہ چلا کہ جہلم کے نزدیک ترکی موڑ پر پل ٹوٹ جانے کی وجہ سے راولپنڈی اور لاہور کے درمیان راستہ بند ہو گیا تھا اس وجہ سے بس لاہور وقت پر نہیں پہنچ سکی ـــــ سوا دس بجے پنڈی کے لیے ایک پسنجر ٹرین کو روانہ ہونا تھا طے یہ ہوا کہ اسی سے چلنا چاہیئے- رفیقِ محترم فضل حسین صاحب کو امیرِ سفر بنایا گیا اور ہم لوگ بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچے، ٹکٹ خریدے گئے، دس بجنے میں چند منٹ باقی تھے، جس کو جس ڈبّہ میں جگہ ملی وہ وہیں سما گیا- ہم کراچی کے چار ساتھی لاہور کے چند رفقاء کے ساتھ ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبّہ میں جا گھسے، اور منّت سماجت کر کے اِدھر اُدھر جگہ حاصل کر ہی لی ـــــ اسٹیشن پر یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ گاڑی نہیں جائے گی راستہ میں ریلوے ٹریک ٹوٹ گیا ہے، پنڈی سے کوئی گاڑی نہیں آرہی- لیکن ہم اللہ کے بھروسے پر اطمینان سے بیٹھ گئے، جو اللہ کو منظور ہو گا سو ہو گا، جب گاڑی میں بیٹھ ہی گئے ہیں تو اللہ نے چاہا تو کسی نہ کسی وقت پنڈی پہنچ ہی جائیں گے ـــــ لیکن یہ کیا ہوا ــ! گارڈ نے سیٹی بجائی، جھنڈی ہلائی اور ہماری پسنجر ٹرین نے ٹھیک سوا دس بجے پلیٹ فارم چھوڑ دیا- امید بندھی کہ انشاء اللہ العزیز وقت پر تربیت گاہ پہنچ جائیں گے ـــــ اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہی مُسبّب الاسباب ہے-

اب پسنجر ٹرین تھی اور ہم تھے ـــــ ہر اسٹیشن پر رکتی اور جہاں اسٹیشن نہ ہوتا وہاں بھی رکتی کبھی چلتی کبھی رکتی، کبھی رکتی کبھی چلتی ـــــ ایک تو پسنجر ٹرین اور وہ بھی گویا پیدل چل رہی تھی ـــــ سچ پوچھیئے مجھے تو شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" کا مزہ آرہا تھا ـــــ پاکستان کی تشکیل سے قبل ہندوستان میں پسنجر ٹرین میں بیٹھا تھا یا اب بیٹھا ہوں ـــــ ایک تو وہ سپر ایکسپریس تھی کہ کراچی سے چلی تو لاہور تک گویا اُڑی جا رہی تھی ـــــ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"ـــ گنتی کے صرف چند ہی اسٹیشنوں پر رکی اور ایک یہ پسنجر ٹرین ہے کہ جدھر دیکھتا ہوں اسٹیشن ہی اسٹیشن ہے

نہیں آتا جو اِس ـ ٹے ـ شن، تو گھنٹوں تک نہیں آتا
مگر آنے کو ہوتا ہے تو پھر منٹوں میں آ"تا ـــــ ہے

بعض مقامات پر تو گھنٹوں کے حساب سے رُکی اور خیال آتا گویا انجن میں کوئلہ ختم ہو گیا ہو اور شوکت تھانوی کا "للّو فائرمین" قریبی گاؤں سے کوئلہ لینے گیا ہو- ایسے موقعوں پر مختلف ڈبوں

میں بکھرے ہوئے رفقاء نیچے اُتر آتے، ایک دوسرے کا حال دریافت کرتے، تعارف ہوتا، پھر تعارف مزید ہوتا، چاروں طرف بکھرے قدرت کے حسین نظاروں سے محظوظ ہوا جاتا اور یہ سامنے کھڑے انجم صاحب مجھ سے کہتے کہ اپنے رپورتاژ میں ان نظاروں کا ذکر کرنا نہ بھولنا۔ بھائی مسرور تو ان نظاروں کو دیکھ دیکھ کر جھوم جھوم جاتے۔ یہ عظیم کوہسار، یہ حسین وادیاں، یہ آب جو، یہ پھول، یہ پودے، یہ سبز مخملی فرش، بے چین سے ہو کر کہتے کہ جی چاہتا ہے کہ کراچی کی ہنگامہ خیز زندگی کو خیر باد کہہ کر یہاں پہ ایک کٹیا ڈال لوں ؎

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑہ ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو

ہماری پسنجر ٹرین خراماں خراماں بلکہ ہماری کراچی کی "آنجہانی" ٹریوے کی طرح "ٹراماں ٹراماں" ساڑھے پانچ گھنٹہ لیٹ ——— جی ہاں صرف ساڑھے پانچ گھنٹے لیٹ ——— راولپنڈی اسٹیشن پہ پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے لیے چار کاریں بھجوا دی تھیں جن پر سوار ہو کر ایک بجے کے قریب ہم یتیم خانہ میں داخل ہو گئے ——— اور داخل ہوتے وقت نہ جانے کیوں مجھے یتیموں کا گایا ہوا وہ گانا یاد آ گیا جس سے ایک فلم "درد" کی ابتدا ہوتی تھی ——— یہ میرے دورِ جاہلیت کی بات ہے ——— ایک مصرعہ فلم کا ہیرو اقبال (جو کہ ابھی یتیم بچہ تھا) پڑھتا تھا اور پھر سب یتیم بچے اس کو کورس میں دہراتے تھے۔ ابتدا اس طرح ہوتی تھی ؎

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دیں گے

اور میں سوچنے لگا کہ آج ہمارا دین جس غربت کی حالت میں ہے، کاش کہ ہم اس کا درد بھرا افسانہ دنیا کو سنا سکیں، کاش کہ ہم نیند کے ماتوں کو جگا سکیں۔ کاش کہ ہم لوگوں کے دلوں میں دین کے لیے محبت کی آگ بھڑکا سکیں ——— کاش کہ ہماری اس قرآنی تربیت گاہ سے یہ فائدہ تو ہمیں ہو سکے۔ کاش کہ دین کی راہ میں ہماری جدّ و جُہد ؎

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّہ ذرّہ کو شہیدِ جستجو کر دے

تو صاحبو! ہم تربیت گاہ پہنچ گئے، ہمارے بعد رات تک بلکہ دوسرے دن تک کراچی، سکھر اور دوسرے شہروں سے قافلے آتے رہے ——— تو آئیے اب آپ کو اس تربیت گاہ کی ایک سیر تو کرا دیں۔ مری روڈ پر سٹلائٹ ٹاؤن سے آگے داہنے ہاتھ کو یہ انجمن فیض الاسلام کا یتیم خانہ ہے

جو دار الشفقت کے نام سے موسوم ہے اور یہ علاقہ فیض آباد کے نام سے معروف ہے۔ اس کے صدر دروازہ پر ایک بڑا بینر "قرآنی تربیت گاہ" کا لگا ہوا ہے اور اس کے ارد گرد دور تک جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ جھنڈیاں کیا ہیں قرآنی تربیت گاہ کے پوسٹر ہیں جو خاصی بڑی تعداد میں راولپنڈی اور اسلام آباد کی دیواروں پر چسپاں کیے گئے ہیں۔ پبلسٹی کا اچھا خاصا انتظام ہے۔ پنڈی اور اسلام آباد کی دیواروں پر پوسٹرز کے علاوہ اہم مقامات پر کپڑے کے بینرز، بسوں کے پیچھے ٹین کی چادروں پر اشتہارات اور مقامی اخبارات "پاکستان ٹائمز"۔ "نوائے وقت" اور "جنگ" میں اشتہارات، یہ سب کچھ انجمن خدام القرآن کے شعبۂ نشر و اشاعت کی کارکردگی ہے ——— صدر دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہی آپ کو سامنے کے بلاک میں ہال نظر آئے گا۔ بائیں جانب سبزہ زار ہے جس کے چاروں طرف رنگا رنگ گلاب کے پودوں کی باڑ ہے۔ اس سے پرے پانی کا OVER-HEAD ٹینک اور باتھ روم، غسل خانوں کی قطاریں ہیں۔ دائیں جانب ایک دو منزلہ بلاک ہے جس پر "قیام گاہِ یتامیٰ" کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ یہ ہماری قیام گاہیں ہیں۔ پشت کی جانب ایک چھوٹا سا بلاک ہے جس میں باورچی خانہ اور طعام گاہ ہے۔

آئیے پہلے ہال کی طرف چلتے ہیں۔ سب سے پہلے نظر اس بینر پر پڑتی ہے جو ہال کے باہر لگا ہے، جس کا رنگ آسمانی ہے اور اس پر خوشنما الفاظ میں یہ آسمانی ہدایت تحریر ہے: ——— "فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ ط"

ہال میں داخلہ سے قبل ایک برآمدہ ہے جس کے ایک جانب نہایت قرینہ سے مرکزی انجمن خدام القرآن کا مکتبہ لگا ہوا ہے۔ محمد حنیف ورک صاحب اور ہمارے کراچی کے رفیق عبدالرزاق صاحب یہاں ڈیوٹی پر ہیں۔ سامنے کی جانب ہال کے دو دروازے ہیں اور ایک دروازہ پشت کی جانب کھلتا ہے۔ علاوہ ازیں دو چھوٹے بغلی دروازے بھی ہیں۔ اس وسیع و عریض ہال میں اسٹیج کے لیے تختہ چبوترہ بنا ہوا ہے۔

اسٹیج کے اوپر ایک بہت بڑا بینر لگا ہے جس پر سورۂ جمعہ کی یہ آیت تحریر ہے: ——— هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ط" اس بینر کے دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے بینرز لگے ہیں، ایک پر سورۂ صف کی یہ آیت تحریر ہے: "كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝" اور دوسرے پر یہ آیت تحریر ہے: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ"

ہال میں اسٹیج کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہوں تو دائیں جانب اوپر کی طرف خواتین کے لیے ایک گیلری ہے، جس کی سیڑھی برآمدہ میں سے جاتی ہے۔ اس گیلری کے سامنے ایک بہت بڑا بینر لگا ہے جس پر سورۃ صف کی یہ آیت تحریر ہے:۔ "هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ o" اور اس کے دونوں طرف علامہ اقبال کے اشعار پر مشتمل دو بینرز لگے ہیں، ایک پر لکھا ہے: ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور دوسرے پر تحریر ہے:— ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

اسی طرح ہال کے بائیں جانب دیوار پر دو بڑے بڑے بینرز لگے ہیں جن پر علامہ اقبال کے یہی دو اشعار کچھ اور خوبصورتی اور جلی حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ ہال میں بیٹھنے کے لیے دریاں بچھی ہوئی ہیں۔ چھت خاصی اونچی ہے جس میں پنکھوں کے علاوہ بڑے بڑے فانوس لٹکے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے اوپر ایک گھڑی لگی ہے جو بند پڑی ہے۔ اسٹیج کے دائیں جانب "راہِ نجات" کا رنگین برقی تختہ لگا ہوا ہے جس پر سورۃ والعصر کا متن اور اس کا ترجمہ آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔ صدر دروازے سے ہال کی کی جانب آتے ہوئے بائیں جانب آپ کو ایسا ہی ایک رنگین برقی تختہ نظر آئے گا جس پر "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" چمک دمک رہے ہیں۔

داہنی طرف قیام گاہوں کا دو منزلہ بلاک ہے، یہاں جو بچے مقیم تھے انہیں کچھ روز کے لیے چھٹی دے کر ان کے عزیزوں کے گھروں پر بھیج دیا گیا ہے۔ کچھ بچے جو رہ گئے تھے وہ پشت کی عمارت میں منتقل ہو گئے ہیں اور ان سب کی جگہ اب ہم نے لے لی ہے —— تین بڑے کمرے اوپر اور تین کمرے نیچے —— ان میں قرینے سے بستر بچھے ہوئے ہیں، دیوار میں الماری کی طرح لکڑی کے بڑے بڑے خانے ہیں جن میں سامان رکھ دیا گیا ہے۔ مختلف شہروں کے رفقاء کمروں میں گھُلے ملے ہیں۔ ملنے کے ایسے مواقع کم ہی ملتے ہیں —— کچھ کمروں میں لوہے کی چارپائیاں تھیں جو رفقاء نے باہر نکال دیں اس لیے کہ انہیں یہ اچھا نہ لگا کہ کچھ ساتھی نیچے سوئیں اور کچھ چارپائیوں پر —— ع:۔ "تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے!" —— یہی جذبہ رہائش گاہ میں بھی نظر آ رہا ہے۔ ہر کمرہ کا ایک ناظم ہے جو صفائی ستھرائی اور کمرہ کے مکینوں کی ضروریات کا ذمہ دار

ہے اور ناظمِ قیام گاہ کے آگے جوابدہ ہے۔

اب یہ طعام گاہ ہے، یہاں فرش بچھا ہے۔ کھانے کے وقت دستر خوان بچھ جاتا ہے! ایک جانب باورچی خانہ ہے اور اُس سے پرے غسل خانہ اور بیت الخلاء۔

اور یہ ہال کی پشت پر دو کمروں کا ایک چھوٹا سا بلاک ہے۔ اس کے ایک کمرہ میں میرِ کاروال ڈاکٹر اسرار احمد کا قیام ہے ؎

اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگاہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اور دوسرے کمرے میں دفتر ہے ناظمِ اعلیٰ ملک محمد بشیر صاحب کا، جہاں ان کا قیام بھی ہے اور اُن کے ساتھ ناظمِ طعام گاہ حاجی محمد یوسف صاحب اور راقم الحروف بھی مقیم ہیں۔

اور اس کا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا ہوں۔ یہ جو رہائش گاہوں اور ہال کے درمیان وسیع صحن ہے اس کے بیچوں بیچ تین چار پلنگ پڑے رہتے تھے ——— یہ سکھر کے رفقاء نے ڈالے ہوئے ہیں جو رات کو ان پر سوتے ہیں۔ سکھر یوں بھی لاہور اور کراچی کے تقریباً درمیان واقع ہے شاید اسی مناسبت سے وہاں کے رفقاء نے صحن کے درمیان یہ جگہ منتخب کی ہے ——— دن کو فارغ اوقات میں یہ پلنگ چوپال کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ——— مختلف کمروں سے رفقاء یہاں آتے جاتے ہیں، تجدیدِ ملاقات ہوتی ہے، حالاتِ حاضرہ پر تبصرے ہوتے ہیں، دین کی باتیں ہوتی ہیں، کچھ گپ شپ ہوتی ہے ——— جیسے جیسے دھوپ آتی جاتی ہے پلنگ سائے کی طرف سرکتے جاتے ہیں۔ تربیت گاہ کا انتظام بحسن و خوبی چلانے کے لیے ناظمین کا تقرر کیا گیا ہے۔ آئیے آپ کا ان سے تعارف کرائیں :-

● **ناظمِ اعلیٰ** : جناب ملک محمد بشیر صاحب ——— ہماری فوج کا بوڑھا جرنیل لیکن دل جوان ہے، عمر ساٹھ سال سے متجاوز لیکن اُن کی ہمت، محنت اور کام سے اُن کی لگن دیکھ کر جوانوں کو بھی رشک آئے۔ کبھی خاکسار تحریک سے وابستہ تھے اور اب دین کی راہ میں شب و روز چپ راست! چپ راست! ——— پیتے کا جگر اور شاہیں کا تجسّس، جیسے کہہ رہے ہوں ؎

جو کبوتر پہ جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

● **ناظمِ اجتماع گاہ (ہال)** : جناب مختار حسین فاروقی صاحب ——— نوجوان انجینئر ہر وقت کام میں لگا ہوا، شادی کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ——— کام سے اُسے عشق ہے کام

نہ ہو تو شاید بجا رپڑ جائے سے

قورہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول	لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

● **ناظمِ رہائش گاہ** : جناب الطاف حسین صاحب، تعلیم کے لحاظ سے ایڈووکیٹ اور کام کے لحاظ سے ایک مستعد رضا کار، خود ناظمِ رہائش گاہ ہیں لیکن رہائش گاہ میں رہائش پذیر نہیں۔ ڈیرہ طعام گاہ میں ڈال رکھا ہے، جہاں چاہتے ہیں سو جاتے ہیں سے

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں	کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

بنیان پہنے اور تہمد باندھے، تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔ کام میں ہر وقت مستعد، ہر ایک سے پوچھتے ہیں "بھائی کسی چیز کی ضرورت تو نہیں! بھائی کوئی تکلیف تو نہیں"۔ نیز پھر کسی کام میں عار نہیں۔ ابھی ترکاری چھیل رہے ہیں تو ابھی لوگوں کو کھانا کھلا رہے ہیں اور پھر خود ہی دسترخوان صاف کر رہے ہیں۔

● **ناظم طعام گاہ** :۔ جناب حاجی محمد یوسف صاحب، ریلوے میں اکاؤنٹس آفیسر ہیں ــــــ باورچی کو لاہور سے ساتھ لائے ہیں، کھانا جو بھی پکواتے ہیں لذیذ پکواتے ہیں۔ رفقاء اپنے ڈھیر سارے مشوروں سے روزانہ انہیں اس مسئلہ سے قطعی آزاد کر دیتے ہیں جو گھر کی ہر خاتون کو روز پریشان کرتا ہے کہ "آج کیا پکے گا؟" ــــــ کھانے کا جب ذکر آگیا ہے تو یہ بھی سنتے چلئے کہ راولپنڈی کے چند احباب نے ڈاکٹر صاحب اور تمام رفقاء کو باصرار کھانے پر مدعو کرنا چاہا تو شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی گئی کہ وقت کے علاوہ چھپن حضرات کے آنے جانے کا مسئلہ بھی تھا۔ پیشکش ہوئی کہ کھانا قیام گاہ پر بھجوا دیا جائے مگر اس میں بھی چند دوسری باتوں کے علاوہ ایک دلچسپ قباحت یہ آڑے آئی کہ قیام ہمارا بہرحال یتیم خانہ میں تھا جہاں یتیموں کے لیے کھانا آنا ایک معمول تھا ــــــ چنانچہ اگر ہمارے لیے کھانا آئے تو کہیں یتیم بچے یہ خیال نہ کریں کہ کھانا آیا تو ان کے لیے تھا لیکن کھا گئے قرآنی تربیت گاہ والے ــــــ بصد شکریہ اس پیشکش پر بھی معذرت کر لی گئی۔

● **ناظمِ بیت المال** :۔ جناب رحمت اللہ بُٹر، یہ رفیق کسی سرکاری ادارہ میں اکاؤنٹنٹ ہیں ــــ ہر وقت حساب کتاب میں کھوئے ہوئے ــــ طعام کی مد میں ہر رفیق سے (آٹھ روز کی) مقررہ رقم وصول کر رہے ہیں ــــ کم یا زیادہ کوئی دے دے تو کوئی بات نہیں ــــ آمد و خرچ کا پورا حساب رکھ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں حسبِ ذیل ذمہ داریاں اس طرح سپرد کی گئی

ہیں :- اذان : جمیل احمد صاحب دیتے ہیں اور نماز : قاری عبدالقادر صاحب پڑھاتے ہیں جو ہال میں ادا کی جاتی ہے۔ دن کے پروگراموں میں مطالعہ کے انچارج شیخ جمیل الرحمٰن صاحب ہیں جن کی معاونت مختار حسین فاروقی کرتے ہیں۔ تربیت گاہ میں شرکت کے لیے باہر سے جو رفقاء آئے ہیں اُن کی تعداد شہروار درج ذیل ہے۔

لاہور (۳۲) کراچی (۱۴) سکھر (۳) شیخوپورہ (۱) سرگودھا (۱)
گوجرانوالہ (۲) ہری پور ہزارہ (۱) میرپور آزاد کشمیر (۲) کل میزان : ۵۶۔

لاہور سے ہمارے بعض سینئر رفقاء جو ریلوے میں ملازم ہیں۔ سیلاب کی وجہ سے ایمرجنسی کے پیشِ نظر نہیں آسکے۔ بہرحال ایسے حالات میں جب کہ پورے ملک میں بارشوں اور سیلاب سے قیامت صُغریٰ برپا ہو، راستے مسدود ہوں، چھپّن حضرات کا اپنا گھر بار چھوڑ کر اور اپنے لواحقین کو خدا کے سپرد کر کے یہاں تربیت گاہ میں آنا، مَیں سمجھتا ہوں کہ ہماری اس نئی تحریک کے لیے ایک نعمت ہے جس پر ہم خدا کا جتنا بھی شکر کریں، کم ہے ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو

اُمّتِ مُسلمہ گو اپنے بگاڑ کی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ ؎

بُجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

لیکن اب بھی اگر کوشش کی جائے تو اس راکھ کے ڈھیر میں بھی وہ چنگاریاں پوشیدہ ہیں جو اگر ایک بار بھڑک اٹھیں تو اس عالمِ پیر کو خاکستر کر کے ایک جہانِ نَو پیدا کر سکتی ہیں۔ ہم مایوس نہیں ہیں، امّید کا دیا لیے پھر رہے ہیں ؎

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ چند جیالے اُٹھیں، چند فرزانے سر سے کفن باندھ کر اپنی کشتیاں جلا کر، آتشِ نمرود میں کُود پڑیں اور تحریک کو اپنا خونِ جگر پلا کر پروان چڑھائیں کیونکہ ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

تربیت گاہ کا پروگرام شروع ہونے سے قبل ایک واقعہ ایسا ہو گیا جس سے اس کا انعقاد

ہی خطرہ میں پڑ گیا تھا ـــــ ہوا یہ کہ اس بستی میں پانی کی فراہمی بند ہو گئی ـــــ یہ بستی جو فیض آباد کے نام سے موسوم ہے، یہاں پانی کا کنکشن نہ راولپنڈی سے ہے اور نہ اسلام آباد سے۔ یتیم خانہ کا اپنا ایک ٹیوب ویل ہے جس سے OVER-HEAD ٹینک میں پانی چڑھا کر پوری بستی کو فراہم کیا جاتا ہے ـــــ اس ٹیوب ویل میں کوئی بہت بڑی خرابی پیدا ہو گئی جو باوجود کوشش کے دُور نہ ہو سکی ـــــ ڈاکٹر صاحب اور چند کارکنان جو پہلے پہنچ گئے تھے اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ فراہمیٔ آب کے ذرائع کے فقدان کے پیشِ نظر انہوں نے جمعہ کو تقریباً طے کر لیا تھا کہ اس تربیت گاہ کے انعقاد کو منسوخ کر دیا جائے چنانچہ وہ بذریعہ فون لاہور، سکھر، کراچی اس منسوخی کی اطلاع دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس فیصلہ تک پہنچنے میں اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ سیلاب کی تباہ کاریوں اور راستوں کے مسدود ہونے کی خبریں بھی شامل تھیں۔ جب ڈاکٹر صاحب کے بھائی اقتدار احمد صاحب کو معلوم ہوا کہ پانی کے فقدان کی وجہ سے یہ پروگرام منسوخ ہو رہا ہے تو انہوں نے پانی کی مستقل فراہمی کے انتظام کی ذمہ داری لے کر چند گھنٹوں میں اس کا بندوبست کرا دیا۔ وہ کہیں سے ایک ٹینکر لاری کا خالی ٹینک لے آئے اور اس میں پائپ لگا کر ٹونٹیاں لگا دیں۔ اس کے علاوہ بہت سے خالی ڈرم لا کر رکھ دیئے اور مقامی میونسپلٹی کی ٹینکر لاری کے ذریعہ روزانہ پانی بھروانے کا انتظام کرا دیا چنانچہ اس انتظام کو تائیدِ غیبی سمجھا گیا۔ اس طرح کسی حد تک یہ مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن اب ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا۔ غسل خانے اور بیت الخلاء جو ذرا فاصلہ پر تھے اس وقت تک استعمال نہ ہو سکتے تھے جب تک وہاں پر پانی کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو ـــــ اب باورچی خانہ کے برابر والا صرف ایک غسل خانہ اور ایک بیت الخلاء قابلِ استعمال تھا۔ ایک انار و صد بیمار والی کیفیت تھی ـــــ اور اس بیماری کا علاج ہمارے ڈاکٹر صاحب نے یہ کیا کہ رفقاء سے فرمایا کہ آپ میں سے جو حضرات دیہات سے تعلق رکھتے ہیں یا "زیادہ" شہری نہیں ہیں وہ آس پاس لہلہاتے کھیتوں میں جا کر رفع حاجت کر لیا کریں۔ باقی حضرات اس ایک بیت الخلاء ہی پر اکتفا کریں اس طرح ہماری ذہنی، جسمانی اور روحانی تربیت کا آغاز ہو گیا۔

اور سنیئے! ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہمارے ایک "کولمبس" صاحب نے قریب ہی فرلانگ بھر کے فاصلے پر صاف ستھرے بہتے پانی کی ایک ندی "دریافت" کر لی۔ بس پھر کیا تھا ـــــ نہانے اور کپڑے دھونے کا انتظام وہاں ہو گیا۔ "کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد" (جاری)

رفتارِ کار

دعوتِ رجوع الی القرآن

راولپنڈی / اسلام آباد جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں گاہے گاہے، راولپنڈی اور اسلام آباد تشریف لے جاتے رہے ہیں، جہاں مختلف مقامات پر درس قرآن اور خطابات کا بعض معاونین کے تعاون سے انتظام ہوتا رہا ہے۔ لیکن وہاں دعوت رجوع الی القرآن کے لئے کوئی باقاعدہ نظم قائم نہیں تھا ۸ اگست ۷۶ء سے ۱۵ اگست تک دارالشفقت فیض آباد میں جو آٹھ روزہ قرآنی تربیت گاہ منعقدہ ہوئی تھی (جس کی تفصیلی روداد رفیق محترم قاضی عبدالقادر تحریر کر چکے ہیں جو انشاء اللہ میثاق ہی میں قارئین کے مطالعہ میں آئے گی)، تو بفضلِ تعالیٰ سبحانہٗ اس تربیت گاہ کی بدولت جہاں وسیع پیمانہ پر دعوت رجوع الی القرآن کی نشر و اشاعت ہوئی وہاں معتدبہ تعداد میں ایسے صاحبانِ دِل و ذوق بھی میسر آگئے جنہوں نے دعوت و فکر قرآنی کی نشر و اشاعت کے مقصد کی خاطر باقاعدہ نظم کے قیام کے لئے تن، من، دھن سے تعاون کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جزاھُمُ اللّٰہ خیراً۔ چنانچہ راولپنڈی اسلام آباد میں انجمن خدام القرآن راولپنڈی قیام کا فیصلہ ہو گیا۔ جس کے جملہ مراحل بحمد اللہ تکمیل پا چکے ہیں۔

پنڈی اور اسلام آباد کے رفقاء کے تعاون سے ماہ اکتوبر ۷۶ء کے لئے ڈاکٹر صاحب کے درس و خطاب عام کا ایک گھمبیر پروگرام ترتیب دیا گیا۔ جس کی اجمالی روداد حسب ذیل ہے۔

۱۷ اکتوبر، بروز اتوار ڈاکٹر صاحب مسجد شہدا کے اتوار کے مستقل درس سے فارغ ہو کر راولپنڈی تشریف لے گئے۔ جہاں اسی شام بعد نماز مغرب جامع مسجد اہل حدیث اسلام آباد (نزد دفتر کارپوریشن) میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ یہ خطاب

تقریباً سوا دو گھنٹہ جاری رہا۔ محترم جناب مولانا عبدالعزیز صاحب خطیب و امام مسجد ہذا اور اراکین مجلس انتظامیہ نے پورا پورا تعاون فرمایا حتیٰ کہ اس روز نمازِ عشاء معمول کے وقت سے تقریباً پون گھنٹے تاخیر سے ادا کی گئی، جس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اسلام آباد کے رہائش گنندگان کے علاوہ پنڈی سے بھی خاصی بڑی تعداد میں لوگ اس خطاب کو سننے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شرکاء کی عظیم اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل تھی مجموعی تعداد دو سو سے بھی متجاوز تھی۔ تمام ہی حضرات ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے بے حد متاثر ہوئے۔ مولانا عبدالعزیز صاحب موصوف نے بھی انتہائی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور آئندہ بھی بھرپور تعاون کی پیش کش فرمائی۔

۱۸ اکتوبر، بروز پیر | ڈاکٹر صاحب نے جامع مسجد (اہل حدیث) موہن پورہ کشمیری بازار میں سورہ تغابن کے پہلے رکوع کا درس دیا جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا۔ حاضری خاصی تھی۔ اس درس کو سننے کے لئے دور دور سے لوگ آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا درس انتہائی پُر تاثیر تھا۔ جس نے دلوں میں ایمان کی چنگاری کو فروزاں کر دیا تھا۔ مسجد کے خطیب جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مسجد کمیٹی کے صدر جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب آٹھ روزہ قرآنی تربیت گاہ کے دروس میں بھی اکثر شریک ہوتے رہے تھے اور اسی موقع پر ہر دو حضرات نے قرآن کی دعوتِ جہاد و انقلاب کی نشر و اشاعت کے لئے اپنے ذاتی تعاون اور مسجد کو اسی موقع پر پیش فرما دیا تھا۔ جزاھم اللہ خیراً۔ ماہ اگست میں بھی اس مسجد میں ایک درس قرآن اور خطبہ ہو چکا ہے

——— اسی روز بعد نماز مغرب عرشی مسجد (احناف) بلاک۔ اے سیٹلائٹ ٹاؤن میں ڈاکٹر صاحب نے سورہ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کا درس دیا۔ شمع قرآنی کے پروانے شہر کے تقریباً ہر چہار اطراف سے جمع ہو گئے تھے کافی حاضری تھی منتظمین مسجد نے پورا پورا تعاون فرمایا اور آئندہ کے لئے تعاون کی پیش کش کی۔ یہاں بھی نماز عشاء درس قرآن کی وجہ سے مقررہ وقت سے تقریباً نصف گھنٹہ تاخیر سے ادا کی گئی۔ جس کا پہلے سے اعلان کر دیا گیا تھا۔

——— اسی شب کو بعد عشاء جناب ڈاکٹر (ریٹائرڈ کرنل) عبدالغفور شیخ صاحب کے مکان ۵۰۸ سیٹلائٹ ٹاؤن میں مشاورتی اجتماع انجمن خدام القرآن

راولپنڈی / اسلام آباد منعقد ہوا۔ جس میں انجمن کی قرارداد تاسیس (جو مرکزی انجمن کی قرارداد تاسیس کے عین مطابق ہے) اور انجمن کے قواعد وضوابط (دستور العمل) منظور کئے گئے۔ جس کے بعد سال ۷۶-۷۷ء کے لئے حسب ذیل اعزازی عہدیدار، نیز اراکین مجلس منتظمہ منتخب کئے گئے۔

۱ - صدر انجمن :- جناب خواجہ غلام محمد بٹ صاحب

۲ - اعزازی معتمد :- جناب ڈاکٹر (ریٹائرڈ کرنل) عبدالغفور شیخ صاحب

معاون معتمد :- جناب مقصود الٰہی صاحب

ناظم مالیات :- جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب

محاسب :- جناب محمد نذیر صاحب

اراکین مجلس منتظمہ :- (۱) جناب عبدالقدوس صاحب (۲) محمد ادریس صاحب (۳) جناب محمد فاروق صاحب (۴) جناب عبدالحق صاحب (۵) جناب محمد نجیب اللہ صاحب (۶) جناب مستنیر احمد صاحب (۷) جناب محمد اسلم صاحب

نوٹ :- فی الحال انجمن کا پتہ یہ ہے :- انجمن خدام القرآن - معرفت ڈاکٹر (ریٹائرڈ کرنل) عبدالغفور شیخ صاحب، A - ۵۰ سٹلائٹ ٹاؤن - راولپنڈی)

۱۹ / اکتوبر بروز منگل | اس روز بعد نماز فجر مرکزی جامع مسجد اہل حدیث جامع مسجد روڈ - راولپنڈی میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے سورہ تغابن کے دوسرے رکوع کا درس دیا۔ درس سے قبل جامع مسجد کے خطیب و امام شیخ الحدیث جناب مولانا محمد صادق صاحب مدظلہ العالی نے ڈاکٹر صاحب موصوف اور ان کی دعوت قرآنی کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا اور نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں اس کام کی تحسین فرمائی اور اس کی افادیت پر اظہار خیال فرمایا نیز اس کے مقبول و ماجور ہونے کی دعا فرمائی۔ اس درس میں ہر چہار طرف سے شمع قرآنی کے پروانے جمع ہوئے تھے۔

خواتین سے خطاب | اسی دن بعد نماز ظہر بر مکان محترم لیڈی ڈاکٹر قیصر سراج صاحبہ اسلام آباد میں خواتین کے ایک اجتماع کو ڈاکٹر صاحب نے سورہ تحریم کی آیت کریمہ :- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا کو موضوع بنا کر

خطاب کیا ــــ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ پنڈی میں منعقدہ آٹھ روزہ قرآنی تربیت گاہ میں بھی اچھی خاصی تعداد میں تعلیم یافتہ خواتین پابندی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآنی اور خطابات سننے کے لئے تشریف لاتی رہیں تھیں۔ نیز خواتین کے اس اجتماع میں بھی اعلیٰ سوسائٹی کی تعلیم یافتہ خواتین نے اچھی خاصی تعداد میں شرکت تھی۔ خواتین کے جو تاثرات ہم تک پہنچے ہیں، وہ اس لحاظ سے اطمینان بخش ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب خواتین کے حلقہ میں بھی بہت پسند کیا گیا اور اس کی افادیت محسوس کی گئی کہ قرآن حکیم کی دعوت کو قرآن مجید ہی کے ذریعہ عام کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

ــــ اسی دن بعد نماز مغرب جامع مسجد جامع اسلامیہ کشمیر روڈ، نزد مٹن مارکیٹ صدر میں ڈاکٹر صاحب نے سورہ حج کی دو آیات کا درس دیا۔ بحمد اللہ یہاں بھی خطیب قاری سعید الرحمٰن صاحب اور منتظمین مسجد نے بھرپور تعاون کیا۔ اس درس میں بھی کافی حضرات شریک ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔

۲۰ / اکتوبر بروز بدھ | یہ تاریخ و دن مرتبہ پروگرام میں شامل نہیں تھا، لیکن محمدی مسجد (اہل حدیث) اصغر مال روڈ کی جانب سے اس مسجد میں درس کی دعوت ملی جو قبول کر لی گئی اور بدھ کی صبح بعد نماز فجر اس مسجد میں ڈاکٹر صاحب نے سورہ حٰم السجدہ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ درس دیا۔

ــــ اس طرح یہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔ اس دورے میں پانچ درس قرآن کی نشستیں ہوئیں دو خطابات ہوئے۔ جن میں سے ایک خطاب میں "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" بیان ہوئے اور دوسرا خطاب خواتین کے لئے ہوا۔

نوٹ:۔ یہ روداد رفیق محترم محمد بشیر ملک صاحب کے تعاون سے سپرد قلم کی گئی ہے۔

کراچی | ڈاکٹر صاحب جولائی میں کراچی تشریف لے گئے تھے جہاں رفقاء سے ملاقاتیں کرنی تھیں اور یونیورسٹی ہوسٹل یونین کے ایک اجتماع کو "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر خطاب کرنا تھا واپسی میں سکھر میں بھی دو دن کے لیے دروس قرآن کا پروگرام تھا۔ لیکن ملتان سے اپنے پھوپھی زاد بھائی شیخ نصیر احمد مرحوم کی تشویش ناک حالت کی خبر ملتے ہی کراچی سے ملتان چلے گئے اور اس مجبوری کے پیش نظر تمام پروگرام منسوخ

کرنے پڑے۔ ماہ اگست میں راولپنڈی کی تربیت گاہ کے انعقاد کے باعث کراچی اور سکھر کا دورہ نہیں ہو سکا۔ رمضان المبارک میں ڈاکٹر صاحب کو عمرہ کی سعادت نصیب ہوئی، چنانچہ حجاز مقدس جاتے ہوئے اور واپسی میں کراچی کے رفقاء سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نیز اس موقع پر دھلی کالونی میں جمعیت پنجابی سوداگران کی زیر تعمیر شمیم مسجد میں بعد نماز عشاء آیت برکا ڈاکٹر صاحب موصوف نے درس دیا۔ ڈاکٹر صاحب ۳۱۔ اکتوبر کو باقاعدہ دورے پر کراچی تشریف لائے۔ اس موقع پر کراچی سب آفس کی طرف سے کراچی کی نواحی بستی رفاہ عام سوسائٹی ملیر ہالٹ کی جامع مسجد میں بعد نماز عشاء سہ روزہ درس قرآن (۳۱ اکتوبر تا ۲ نومبر) کا پروگرام بنایا گیا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے سورہ حدید کے تین رکوعات کا درس دیا۔ ان دروس میں شرکاء کی حاضری دو سو ڈھائی سو کے مابین رہی۔ اس درس میں قریب کی نواحی بستیوں مثلاً سعود آباد، ملیر، ملیر توسیعی کالونی، ڈرگ روڈ اور لانڈھی سے بھی شمع قرآنی کے پروانے جمع ہوتے رہے۔ مسجد کی انتظامیہ اور علاقہ کے چند پُرجوش و مخلص کارکنوں نے جن میں شاہد میاں صاحب پیش پیش تھے پورا پورا تعاون کیا۔ جزاھم اللہ خیرًا اسی دوران میں شاہد صاحب کے مکان A-۹۳ رفاہ عام سوسائٹی میں ایک مشاورت بھی منعقد ہوئی، جس میں علاقہ کے چند وہ حضرات شریک ہوئے جو ڈاکٹر صاحب کے درس سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ اس مشاورت میں طے کیا گیا کہ مطالعہ قرآن کے لئے اس علاقہ میں ایک مستقل حلقہ قائم کر دیا جائے جس میں ہر ہفتہ کو نماز عشاء کے بعد ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب کے منتخب قرآنی نصاب کو سلسلہ وار سنا جائے۔ الحمد للہ اس حلقہ میں باقاعدہ کام شروع ہو گیا ہے۔ اس درس کے بفضلہ تعالیٰ بہت خوشگوار اثرات قائم ہوئے اور بعض حضرات کو یہ کہتے سنا گیا کہ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہی ہے کہ قرآن حکیم کے ذریعہ تجدید ایمان کی کوشش کی جائے۔ راقم الحروف سے مسجد کے اعزازی سیکرٹری صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار تقریباً ان الفاظ میں فرمایا کہ "میں نے علمائے کرام کے سینکڑوں درس اور وعظ سنے ہیں، ان میں یا تو لطائف و نکات بیان ہوتے ہیں۔ یا لوریاں اور تھپکیاں ملتی ہیں الا ماشاء اللہ۔ چونکا دینے والا اور لرزا دینے والا نیز مسلمان کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے والا میں نے پہلی مرتبہ درس سنا ہے۔ دعوت و تبلیغ کا صحیح طریقہ یہی ہے۔" کراچی میں مطالعہ قرآن و حدیث کے لئے ہر اتوار کو ہفتہ واری

اجتماع عام ۲۴/۱ جاپان نیشن ۲-۷ پریڈی اسٹریٹ میں منعقد ہوتا ہے۔

سکھر کراچی سے ۴ نومبر کو ڈاکٹر صاحب سکھر تشریف لے گئے اور موصوف نے انجمن خدام القرآن سکھر کے زیر اہتمام۔ اسی روز بعد نماز عشاء مسجد میونسپل کمیٹی سکھر میں سورہ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کا درس دیا۔ دوسرے دن ۵ نومبر کو گول جامع مسجد بیراج کالونی سکھر میں ایک بجے خطبہ جمعہ سے قبل "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر ایک نئے اسلوب سے خطاب فرمایا۔ اسی دن بعد نماز مغرب مکی مسجد محمد بن قاسم باغ سکھر میں سورۂ بنی اسرائیل کے آخری رکوع کا درس دیا جو تقریباً دو گھنٹے جاری رہا۔ نماز عشاء اس روز معمول کے وقت سے نصف گھنٹہ بعد ادا کی گئی۔ دونوں دروس میں شرکت کے لئے دُور دُور سے لوگ تشریف لائے تھے، حاضرین کی اکثریت تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل تھی۔ خطاب جمعہ میں بھی شہر کے ہر چہار اطراف سے لوگ ڈاکٹر صاحب کا خطاب سننے کے لئے تشریف لائے تھے۔ حاضری کا محتاط اندازہ سات سو تک کیا گیا ہے۔ سکھر کی انجمن کوشش کر رہی ہے کہ وہاں ہفتہ وار اجتماع کا مستقل نظم قائم کیا جائے جس میں قرآنی منتخب نصاب کے ٹیپ سنانے کا انتظام ہو۔

لاہور الحمد للہ لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے مستقل دروس کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر اتوار کی صبح مسجد شہداء ریگل چوک میں درس قرآن حکیم ہو رہا ہے۔ اس مسجد میں جنوری ۱۹۷۲ء سے باقاعدہ درس شروع ہوا تھا۔ یہاں اولاً تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے منتخب قرآنی نصاب کا درس مکمل کیا۔ بعدہٗ سورہ فاتحہ سے قرآن مجید کے مسلسل درس کا آغاز ہوا اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ یہ سلسلہ جاری ہے (درمیان میں چند عارضی وقفے ڈاکٹر صاحب کے بیرون لاہور اسفار کے باعث آتے رہے ہیں)۔ اس مسجد میں ۷ نومبر کو قرآن حکیم کی دو عظیم الشان سورتوں (سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران) کا درس مکمل ہوا، جن کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے نہایت فضائل مروی ہیں اور جن کو حضورؐ نے مختلف ناموں سے موسوم فرمایا ہے۔ جن در "زہراوین" (دو انتہائی تابناک و روشن سورتیں) بھی شامل ہے۔ ۱۴ نومبر سے الحمد للہ سورہ نساء کے درس کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس درس میں ہر ہفتہ چار پانچ سو لوگ شریک ہوتے ہیں، جن کی اکثریت اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ خواتین کے لئے پردے کا انتظام ہوتا ہے۔ مسجد خضراء میں خطاب جمعہ میں ڈاکٹر صاحب "اربعین نووی" سے احادیث اور ان کی شرح و تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ نماز جمعہ کے فوراً بعد اسی

مسجد میں درس قرآن ہوتا ہے ۔ اب سورہ کہف کا آخری رکوع زیر درس ہے ۔ ان شاء اللہ دسمبر سے یہاں سورہ مریم کا آغاز ہو جائے گا ۔ اس مسجد میں تقریباً آٹھ سال قبل منتخب نصاب سے درس قرآن کا آغاز ہوا تھا ۔ جس کے ساتھ ہی خطاب جمعہ کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا ۔ بعدہٗ تقریباً سات سال قبل سورہ فاتحہ سے تسلسل کے ساتھ قرآن حکیم کے درس کا آغاز ہوا جو بحمد اللہ سورہ کہف تک پہنچ چکا ہے ۔ پہلے یہ درس اتوار کی صبح ہوتا تھا ۔ لیکن مسجد شہدا میں جو شہر کے تقریباً وسط میں اور مرکزی مقام پر واقع ہے اتوار کی صبح پابندی کے ساتھ درس کی دعوت ملی تو مسجد خضرا کا مسلسل درس کبھی ہفتہ اور کبھی جمعہ کو بعد نماز عصر یا نماز جمعہ رکھا گیا ۔ ______ اب از بعد نماز جمعہ تا عصر کی اذان جاری رہتا ہے

لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ ہمارے دوسرے رفقاء بھی مختلف مقامات پر منتخب قرآنی نصاب کا درس دے رہے ہیں ۔ ان رفقاء میں مختار حسین فاروقی کا درس بحمد اللہ کافی مقبولیت حاصل کر رہا ہے ۔ اللّٰھم زد فزد ۔

جہلم | اس مرتبہ جناب حکیم فیض عالم صاحب صدیقی خطیب جامع مسجد اہل حدیث محلہ مستریاں کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب ۲۲ نومبر بروز پیر صبح جہلم تشریف لے گئے تھے ۔ ۲۲ نومبر کو بار ایسوسی ایشن میں اور ۲۳ نومبر کو بالترتیب انٹر کالج اور ڈگری کالج کو ڈاکٹر صاحب نے خطاب کیا ۔ تینوں تقاریر کا مرکزی موضوع ہمارے دینی و قومی اور ملی فرائض اور ان کا قرآن مجید سے تعلق تھا ۔ یعنی ہمارے تمام مسائل قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہی سے حقیقی طور پر حل ہوں گے اور آخرت میں تو نجات ممکن ہی نہیں ہے ۔ جب تک کہ قرآن حکیم اور اسوہ رسول ؐ کے مطابق انفرادی و اجتماعی معاملات کو انجام دینے کی طرف توجہ نہ دی جائے ۔ تینوں مقامات پر ڈاکٹر صاحب نے یہی دعوت پیش کی کہ قرآن مجید سیکھو اور سکھاؤ پڑھو اور پڑھاؤ ۔ سمجھو اور سمجھاؤ اور اس پر عمل کرو اور دوسروں کو عمل کرنے کی دعوت دو ۔ بحمد اللہ ہر سہ مقامات پر سامعین پر ان خطابات کے بہت ہی اچھے اثرات مرتب ہوئے ۔ ۲۳ نومبر کو بعد نماز فجر مسجد افغاناں برلب دریائے جہلم ڈاکٹر صاحب نے سورہ والعصر کا درس دیا ۔ اس درس کا انتظام ایک مقامی وکیل صاحب نے کیا تھا ۔

دسمبر میں ۱۲ دسمبر سے ۱۴ دسمبر تک راولپنڈی / اسلام آباد میں اور ۲۰، ۲۱ کو سکھر میں نیز ۲۳ دسمبر کو بعد مغرب تھیوسوفیکل ہال اور ۲۴ تا ۲۶ جمعیت الفلاح ہال کراچی میں خطابات و درس ہوں گے۔

ڈاکٹر اسرار احمد

کے جماعت اسلامی سے تنظیم اسلامی تک

کے ذہنی سفر کی تفاصیل سے آگاہ ہونے کے لئے حسب ذیل مطبوعات کا مطالعہ لازمی ہے

۱۔ تحریک جماعت اسلامی ۔ ایک تحقیقی مطالعہ	قیمت -/۶ روپے
۲۔ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ۔ کرنے کا اصل کام	،، ۱/- ،،
۳۔ دستور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور	،، -/۵۰ ،،
۴۔ ماہ نامہ میثاق بابت ستمبر تا دسمبر ۷۴	،، ۳/۵۰ ،،
۵۔ ،، ،، اکتوبر تا دسمبر ۶۸	،، ۳/- ،،
۶۔ دستور تنظیم اسلامی	،، ۱/- ،،

مزید برآں

۵۶-۵۷ء میں جماعت اسلامی میں پالیسی کے بارے میں اختلاف نے جو ہنگامہ خیز صورت اختیار کی تھی اور جس کے نتیجے میں بہت سے مخلص رہنما اور سرگرم کارکن جماعت سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے تھے

اس کی تفصیلات ڈاکٹر اسرار احمد نے

”نقض غزل“

عنوان سے تحریر کی تھیں جو ماہنامہ ’میثاق‘ کے بعض شماروں میں شائع ہوئیں جو ایک محدود تعداد میں فی سیٹ -/۷ روپے میں حاصل کئے جا سکتے

مینجر مرکزی مکتبہ

۱۲ - افغانی روڈ، سن

Regd. L. No.

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 24 | DECEMBER 1976 | No. 4 & 5

احباب مطلع رہیں کہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

کی جلد اول زیر طبع ہے ۔ اور فی الوقت حسب ذیل حصص دستیاب ہیں :۔

۱ ۔ مقدمہ و تفاسیر آیہ بسم اللہ و سورہ فاتحہ ہدیہ -/-
۲ ۔ ,, ,, ,, ,, ,, و سورہ بقرہ ,, -/-
۳ ۔ جلد دوم مشتمل بر تفاسیر سورہ نساء تا سورہ اعراف ,, -/-
۴ ۔ ,, سوم ,, ,, ,, انفال تا ,, بنی اسرائیل ,, -/-
۵ ۔ ,, چہارم ,, ,, ,, کہف تا ,, قصص ,, -/-

المعلن : ناظم مکتبہ

انجمن خدام القرآن لاہور

اسوہ ... ن ...
جائے تینوں مقا...
پڑھوا اور پڑھاؤ ...
دو ۔ بحمد اللہ ہر سہ مقامات ...
ہوئے ۔ ۲۳ ر نومبر کو بعد نماز فجر
سورہ والعصر کا درس دیا ۔ اس درس
دسمبر میں ۱۲ ر دسمبر سے ۱۴ ر دسمبر تک
نیز ۲۳ ر دسمبر کو بعد مغرب تھیوسوفیکل ہال اور ...

وھڈری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید ۔ مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی ، ... اد ۔ لاہور سے شائع کیا ۔